

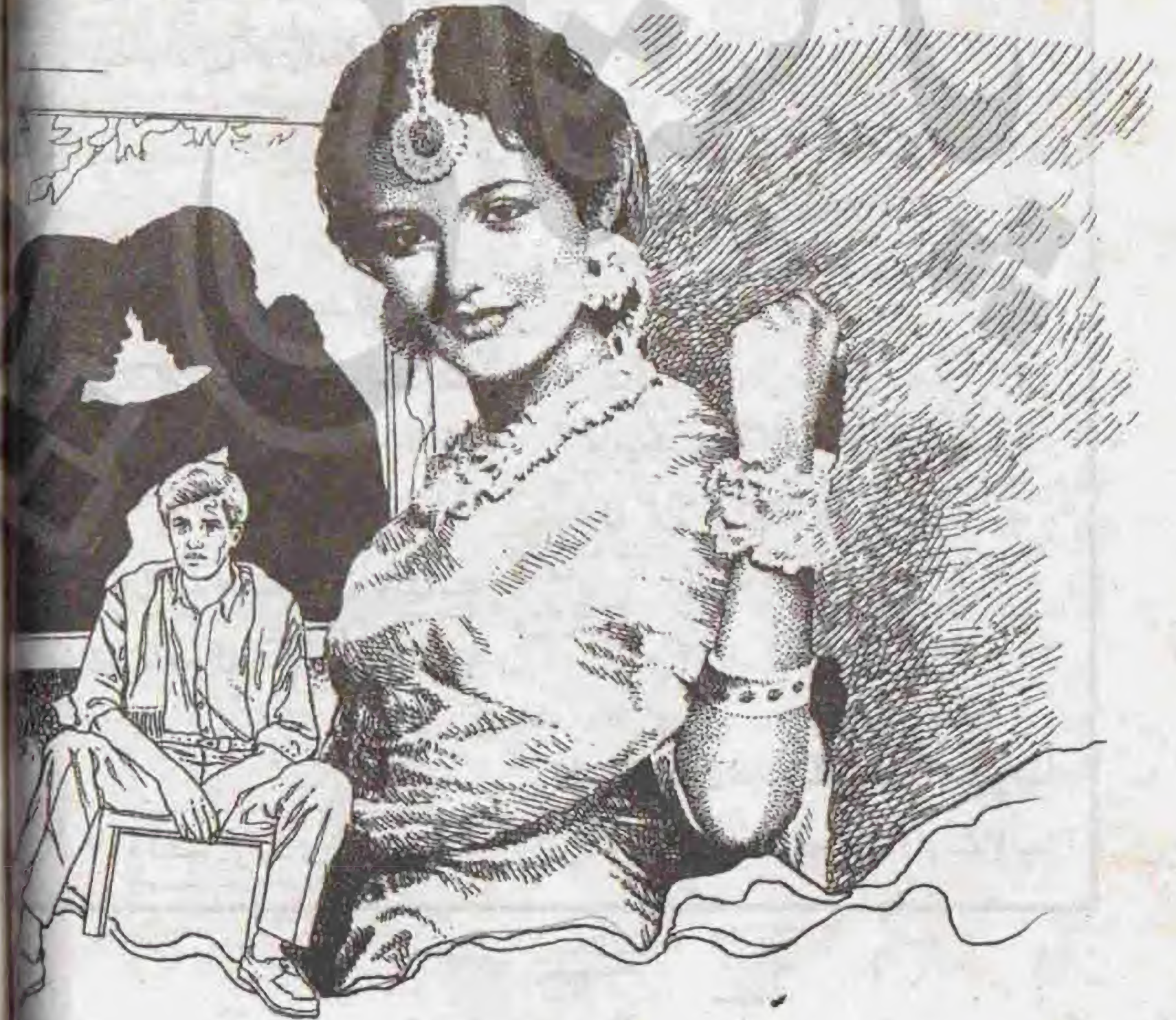
عالیہ حرا

مکمل ناول

چاہتوں کے پرندے

مجھے یقین ہے برف باری کے بعد جو برف پگھلے گی تو سب کچھ گزشتہ گشتہ، محبتوں کا مدفن ہو جائے گا اور محبت، اعتماد، یقین اور شرعی یقین اور شرعی بندھن میں مجھے ملے گی۔ یہ سب سوچتی وہ دیرے دیرے بچوں کا کام چیک کرنے لگی اور پھر.....

چاہتوں کے رنگ لیے ایک خوب صورت مکمل ناول



میرا خیال ہے ہم تھک گئے ہیں ابی جان۔“
اس نے پانی کا پائپ ایک سلائیڈ پر گرا کر فل کھلا ہوا
نلکا بند کیا اور لان میں رکھی اسکاٹی بلوچیز پر بیٹھ گئی۔
”ہم میں اور تم.....“ ابی جان نے گھوم کر دیکھا۔
”جی میں اور آپ اور اب چل کر چائے پیتے
ہیں اور کوئی اچھی سی مووی دیکھتے ہیں۔“
”تمہیں معلوم ہے مریم کہ فوجی لوگ تھکتے
نہیں۔“ ابی جان آرام سے کیاری کی زمین ہموار
کرنے میں مصروف تھے۔
”فوجی آپ ہیں، میں تو نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے
اس نے ٹانگیں سامنے ٹیبل سے ٹکالیں۔
”فوجی کا خون، فوجی کی بیٹی، فوجی کی پوتی تو
ہو۔“ انہوں نے ہارمانی تو سیکھی ہی نہیں تھی اور وہ بھی
مریم سے..... امپا سبل۔

”ابھی یہ سارا جھاڑ جھنکار ٹھکانے لگانا ہے۔“
انہوں نے جھٹ اسے نیا کام بتایا۔
”ایک ماچس کی تیلی دکھا دیں، ابھی ٹھکانے
لگ جائے گا..... یوں۔“ اس نے چنگی بجاتے
ہوئے کہا اور اس عمل پر انہوں نے ایک بار پھر اسے
گھوم کر دیکھا تھا۔
”تاکہ محلے والوں کو پہلے ہفتے ہی شکایت ہو
جائے، ہم لوگوں سے کہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا
ہے۔ ہم اس کی کھا دیتا نہیں گے۔“
”ہم۔“ اب وہ اچھل کر سیدھی ہوئی۔ ”کیسے
مگر میں بہت تھک چکی ہوں۔“ اس نے رونی شکل
بناتے ہوئے کہا۔

”Ozone کی تہہ کو ہم جتنا بچا سکتے ہیں بچا
لیں۔ دھواں بہت خطرناک ہے اس تہہ کے لیے
۔ اس جھاڑ جھنکار کو گڑھا کھود کر دبا دیں گے تو کھا د
تیار ہو جائے گی، جو کیاریوں میں کام آئے گی۔“
مریم نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”فوجی کچھ بھی

ضائع نہیں ہونے دیتے۔“ اس نے ان کی بات کاٹی۔
”ابی جان چائے۔“
”فوجی کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتے۔ اپنے
کام میں مگن، بس فوجی جو کام شروع کر دیں وہ پورا
کر کے دم لیتے ہیں۔“ ابی جان اسے پھر سے فوجی
نامہ سنانے لگے۔

”فوجی! ایک آرمی آفیسر۔“ اس کی آنکھ بھر
آئی۔ دھیرے سے سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ لیفٹ
رائٹ کرنی آگے آئی۔ رسان سے بازو تھام کر انہیں
اٹھایا وہ اٹھ گئے۔ بازو کے اندر اپنا بازو جمائل کر کے
اس نے اندر لاؤنج کی راہ لی اور وہ ساتھ ساتھ چلتے
آئے۔ اکلوتی ملازمہ چائے ٹیبل پر رکھ کر انہیں
بلانے ہی آرہی تھی۔

”جانتی ہوں، تم ایک دلیر فوجی کا مقابلہ نہیں کر
سکتیں۔“ ابی جان پھر شروع ہوئے۔
”نہیں۔“ اس نے ہاتھ صاف کر کے سمو سہ اٹھا
لیا۔ ”میں تو ایک آرمی آفیسر کے ساتھ چائے پینے
آئی ہوں کیوں ناظمہ؟“ مسکراتے ہوئے اس
نے چائے کا سپ لیا اور ابی جان اس کی چالاکی پر
ہنس دیے۔

آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ کمرہ
قدرے گرم تھا۔ اوائل سردیوں کے دن تھے مگر یہاں
پر شاید موسم کے شروع ہوتے ہی ٹھنڈ پوری جولانی
کے ساتھ پڑنے لگتی تھی۔ یہاں کے موسم کا ناظمہ کو
زیادہ پتا تھا کیونکہ وہ یہاں کی رہائشی جو تھی۔ چند ہی
دنوں میں ناظمہ ان کے لیے بہت اچھی ملازمہ ثابت
ہوئی تھی۔ بلکہ اب تو گھر کا فرد ہی بن گئی تھی۔

ناظمہ چائے ادھر ہی لے آئی تھی۔ ابی جان اپنی
روکنگ چیئر پر بیٹھ گئے۔ مریم نے فلور کشن سنبھال
لیے تھے۔ ”ارے پکوڑے، سچ ہلکی ہلکی بھوک کا
احساس ہو رہا تھا۔ تھینک یو۔ ناظمہ۔“ ناظمہ سر

ہلاتے ہوئے ابی جان کو چائے دینے لگی۔

☆.....☆

پچھلے ہفتے یہ لوگ اس بل اسٹیشن پر آئے تھے۔
ایک چھوٹی سی خوب صورت وادی تھی۔ چھوٹی سی
پھاڑی کی سطح پر ان کا کانچ درے اونچائی پر تھا۔
اطراف میں کچھ اور بھی کانچ تھے۔ کچھ میں لوگ
رہائش پذیر تھے، کچھ خالی تھے۔ ابی جان نے اچھے
دنوں میں اپنی پسند اور تھریا بیگم کی خواہش پر یہ بنوایا
تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ رینٹ پر دیا ہوا تھا۔ تاکہ
کوئی قبضہ بھی نہ کر سکے اور حفاظت بھی ہوتی رہے۔
رہنے والوں نے اسے بہت دھیان سے رکھا تھا۔ وہ
کوئی سیاح تھا جو کتاب لکھنے اور سیر و سیاحت کے
لئے آیا تھا۔ یہ ایک خوب صورت لکڑی کا کانچ تھا۔
کانچ کے چاروں طرف گارڈننگ کی گئی تھی۔ ناربل،
مانا، مونگرے اور پینپل کے درخت تھے جن کے
درمیان میں آج کل وہ دونوں کول، مستطیل، محرابی
کیاریاں بنا رہے تھے۔ لان میں جھاڑ جھنکار اور
شک جھاڑیاں بہت تھیں۔ لان کو کاٹ، چھانٹ اور
اسواریت کی ضرورت تھی۔ ابھی صرف کانچ کی
مقانی ہوئی تھی، آرائش باقی تھی۔ یہاں انہوں نے
جانے کب تک رہنا تھا۔ مریم کی شادی تک یا پھر
زندگی کی آخری سانسوں تک۔

فیصل آباد سے یہ لوگ دلگرفتہ اور اداس ہو کر
آئے تھے کیونکہ اولاد جب خود سر، منہ پھٹ، بدلچاظ
اور لاپٹی ہو جائے تو درمیان سے ہٹ جانا ہی بہتر
ہوتا ہے اور کرنل ریٹائرڈ افتخار علی جب سے ریٹائرڈ
زندگی گزار رہے تھے جیسے زنگ خوردہ ہو کر گھر میں
اٹھے تھے۔

کرنل افتخار علی چاہتے تھے کہ ان کی پوتی مریم کی
وادی ان کے کسی پوتے یا نواسے سے ہو۔ مگر تقریباً
سب نے ہی اس کے پروپوزل کو ٹھکرا دیا تھا۔ انہیں

بہو مکمل چیز کے ساتھ چاہیے تھی۔ خوب صورت بھی
ہو اور مالدار بھی۔ اتنی لالچ اپنی ہی بیٹی کے لیے دیکھ
کر کرنل افتخار علی بچ و تاب کھاکر رہ گئے تھے۔
حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یتیم بیٹی کے سر پر ہاتھ
رکھتے کہ بھائی کی نشانی ہے مگر ان کے دل میں جانے
کیسا کینہ اور کدورت تھا۔

مریم ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی بیٹی
تھی۔ اسے فوج میں جانے کا شوق تھا مگر پہلی آنچ پر
کارگل کے محاذ پر اس نے جام شہادت نوش فرمایا
تھا۔ شہریار کے دکھ میں اس کی بیوی زیادہ نہ جی سکی
جب سے مریم کو کرنل افتخار نے ہی اپنے پاس، اپنے
ساتھ رکھ لیا جب تک ان کی بیگم زندہ رہیں۔
مصروفیات تھوڑی کم تھیں مگر ان کے انتقال کے بعد
ساری ہی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آگئی اور اسے
تمام بچوں میں اسپیشل درجہ ملنے لگا تھا۔ اس چیز نے
سب بہوؤں کے دل میں رنجش پیدا کر دی اور اپنے
خوب صورت اسمارٹ اور اچھی نوکری والے بیٹوں
کے لیے انہیں مریم جیسی گندی رنگت والی لڑکی کا رشتہ
قطعی منظور نہیں تھا۔ سب نے اپنے اپنے تئیں
میاؤں کو اس سے بدظن کر دیا تھا۔

مریم کے رشتے کے لیے انہیں ٹوبان سب سے
زیادہ پسند تھا مگر ان سب کی باتوں نے انہیں بری
طرح ہرٹ کر دیا تھا۔ تینوں بیٹوں کی باتیں اگر اتفاقاً
نہ سن لیتے تو خوش فہمیوں کے تمام موسم ان کے ساتھ
تھے۔ چنانچہ اب وہ سب سے بیزار ہو کر اپنے اس
پھاڑی علاقے میں بنے کانچ میں مریم کے ساتھ
آگئے تھے۔

مریم اور وہ یہاں آ کر بہت خوش تھے۔ کچھ
عرصہ کے لیے پریشانیوں سے نجات مل گئی تھی مگر
ایک خیال کرنل افتخار علی کو آنے لگا کہ یہاں تنہا، اس
علاقے میں آ کر انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مریم

کی شادی کی عمر تھی اور یہاں جنگل بیابان میں لوگ سیاحت اور سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں، چہ جائیکہ رشتے کرنے۔ اپنے دو تین دوستوں کو رابلے کے لیے نمبر تو دے کر آئے تھے کہ کوئی رشہ ہو تو بیانا مگر امکان مشکل تھا۔ چنانچہ دونوں دادا پوتی یہاں مزے میں تھے مگر متفکر تھے۔

یہاں نہ کینہ تو زلفیں تھیں، نہ دل جلانے والی باتیں اور نہ ہی آنے جانے پر نظر رکھنے والے لوگ۔ ناظمہ انہیں مفت میں مل گئی تھی۔ وہ ایک ضرورت مند عورت تھی۔ بچے تھے نہیں، شوہر نے بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لی۔ میکے گئی میکے میں بھائیوں کا راج، کون قدر کرتا ہے ماں باپ کے بعد۔ پہاڑی کے نیچے کسی گاؤں کی تھی وہ، ارد گرد کے جنگلوں میں کام کرتی تھی۔ روز آنا جانا اس کے لیے مشکل تھا۔ سوا ایسے ہی سرسری بات ہو رہی تھی۔ اس کی رہائش کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے شریف کام والی عورت دیکھ کر رکھ لیا۔ عورت کی شرافت اس کے چہرے سے پتا چل جاتی ہے۔ مخلص سی ناظمہ کو ایک گھر مل گیا اور انہیں ایک اچھی گھر گرہستی والی عورت۔ دونوں کے کام چل رہے تھے۔

☆.....☆

”ابی جان!“ مریم نے بڑے مصروف سے انداز میں جنگلی شہوت کھاتے ہوئے انہیں پکارا۔ ”ہوں۔“ پرانا اخبار دیکھتے ہوئے انہوں نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ ”ہمیں یہاں کوئی لائبریری دریافت کر لینا چاہیے۔“

انہوں نے ایک بار پھر اسے عینک کے اوپر سے دیکھا۔ انہیں شاید اس کی دماغی حالت پر شک گزرا تھا۔ اس جنگل بیابان میں جہاں لوگ زیادہ تر سیر و سیاحت کے لیے آتے تھے اور مقامی لوگ اتنے

پڑھے لکھے نہیں تھے، ان کی اپنی ضرورتیں ہی بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ اب کے انہوں نے کچھ کہے بغیر اخبار کے اندرونی صفحات کھولنے شروع کر دیے۔ ”یا پھر ہمیں یہاں کسی لائبریری کی داغ بیل ڈال دینی چاہیے۔“ شہوت پلیٹ میں ختم ہو گئے تھے۔ اس نے پلیٹ گھاس پر رکھ دی۔

”ہمیں یہاں کے لوگوں کے لیے کام اور صرف کام کرنا چاہیے میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی اسکول نہیں ہوگا اگر ہوگا تو نیچے وادی میں، بہت دور، کیوں کہ یہاں بچوں کو زیادہ تر میں نے کھیلتے ہی دیکھا ہے۔ کیوں ابی جان؟“ اب وہ ان کی چیر سنبھالے اس پر جمول رہی تھیں۔

”اور آخر ہم یہاں ایسے ہی تو نہیں رہ سکتے۔ یوں بیٹھے بیٹھے تو آپ کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔“ آخری بات کہتے ہوئے وہ زیر لب مسکرائی۔

”ہوں۔“ ابی جان اخبار میں مکمل گم تھے۔

اس کی بات پر آدمی توجہ دی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس لیے دادا کی عدم توجہی کو محسوس نہیں کیا۔ ”اور اگر نہیں تو ہمیں پھر کسی اسکول کی بنیاد یہاں رکھ لینی چاہیے۔ شہر جا کر ہمیں کتابیں، کاپیاں، پمپلین وغیرہ لے آنا چاہیے۔ کالج ہمارا سیٹ ہو گیا ہے۔ لان آہستہ آہستہ ہی سیٹ ہوگا۔ لان کا آدھا کام تو تقریباً ہو ہی چکا ہے۔“ چہار اطراف دیکھ کر اس نے اب عدم توجہی کو محسوس کیا۔ ”ابی جان!“

”ہاں..... ہاں۔ جی ابی کی جان۔“ وہ متوجہ ہوئے تو گود میں رکھا اخبار اور پھر عینک گھاس پر گئی۔ ”کیا بات ہے۔“ اب وہ پوری طرح اس کی جانب گھومے تھے۔ ”کیوں چیخ رہی ہو؟“ بڑے آرام سے کہہ کر انہوں نے پھر سے اخبار اٹھالیا۔ مریم لب

بھیج کر انہیں دیکھنے لگی۔ اخبار اور عینک اٹھا کر انہوں نے اسے دیکھا اور پھر مسکرا دیے۔ ”میں آپ سے نہیں بولتی۔“ سینے پر ہاتھ باندھ کر اس نے خطی سے منہ پھیر لیا۔ سردیوں کی روپوشی دھوپ نے اس کا احاطہ کر لیا اور ابی جان کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”میں تمہارے خیال سے سو فیصد بھی متفق نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے عینک اٹھو سے انہیں دیکھا۔ ”اس لیے بچے کہ.....“ وہ سیدھے ہو کر بیٹھے۔ ”ان سارے کاموں کے لیے پیسہ چاہیے۔ کچھ افراد کی شمولیت چاہیے، بچوں کو پڑھانے کے لیے۔ میرے خیال میں یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں۔ ان کی بنیادی ضروریات جانے کیسے پوری ہونی ہیں۔“ ”اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ جذباتی ہو کر سیدھی ہوئی۔ ”تعلیم بنیادی شعور ہے، آگہی ہے۔ آگے بڑھنے کا، ترقی کرنے کا پہلا قدم ہے۔ ہم اور کچھ نہیں تو آگہی تو دے سکتے ہیں ابی جان۔ قطرہ قطرہ کر کے دریا بنتا ہے..... اور..... اور ہمارا وقت کتنا اچھا گزرے گا اور..... آپ تو.....“ اس نے شاکی سے انداز سے انہیں دیکھا۔

”آپ تو فوجی ہیں۔ فوجی بندے کبھی فارغ نہیں بیٹھ سکتے۔“ اس نے انہیں اموشنی بلیک میل کرنا چاہا۔

اب کے افتخار علی ذو معنی انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ”فی الحال ہم ایسا کرتے ہیں۔“ انہوں نے اخبار میز پر رکھ کر عینک اس پر رکھی۔ ”ہم نیچے وادی کا ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں کچھ کتابیں مل جائیں پڑھنے کے لیے۔ اگر نہیں تو پھر شہر کچھ ہی دور ہے یہاں سے، کل چلیں گے کچھ اور چیزیں بھی لے آئیں گے۔“

دیوار یاد آگئی، در یاد آگیا
دو گام ہی چلے تھے کہ گھر یاد آگیا

کچھ کہنا چاہتے تھے کہ خاموش ہو گئے
دستار یاد آگئی، سر یاد آگیا

اپنے معاملات پہ جب بات آگئی
سب امتیاز عیب و هنر یاد آگیا

دنیا کی بے رخی کا گلہ کر رہے تھے لوگ
ہم کو ترا تپاک مگر یاد آگیا

پھر تیر گئی راہ گزر یاد آگئی
پھر وہ چراغ راہ گزر یاد آگیا

اجمل سراج ہم اُسے بھولے ہوئے تو ہیں
کیا جانیں کیا کریں گے اگر یاد آگیا؟

گئے۔“ اس نے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا۔
ابی جان اس کی بات سنتے ہوئے اب سگار سلاک
رہے تھے۔

”وہیں میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھایا کروں گی۔“
اس کا منظر نامہ تیار تھا۔ ”ٹھیک ہے نا۔“
”ہوں۔“ افتخار علی نے ہنکار بھرا۔
”پھر مجھے نیچے وادی میں اپنے ساتھ لے چلیں
گے نا۔“

پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اکیلے اسے ادھر چھوڑ
کر جانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ مریم انہیں
کتنی عزیز تھی۔ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔
”پھر میں تیاری کروں۔“ اس کے کہنے پر
انہوں نے سر کھما کر اسے دیکھا۔

”آج تو نہیں جا رہے۔“
”پھر کب چلیں گے؟“
”کل یا پرسوں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے
جواب دیا اور کتاب اٹھالی۔ مریم نے بخور ان کا
جائزہ لیا۔ وہ کچھ سنجیدہ سے لگ رہے تھے۔

”ابی جان۔“ وہ دھیرے سے اٹھی اور ان کے
پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ طبیعت ٹھیک ہے آپ
کی۔“ کرمل صاحب نے کتاب کے اوپر سے اسے
دیکھا۔

”میری طبیعت کو کیا ہوا؟“
”مجھے لگ رہا ہے۔“ ان کے گھٹنوں پر ہتھیلیاں
رکھ کر اس نے چہرہ نکالیا۔
”کیا۔“

”آپ یہاں آکر اداس ہو گئے ہیں۔“ کرمل
صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ”کیا آپ کو کھر
والے یاد آتے ہیں۔ ربیعہ، بمشرہ، آیان، منو چہر۔“ وہ
رک گئی۔ اس نے ٹوبان کا نام نہیں لیا تھا۔ ”واپس
چلیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے جوش سے سر ہلایا تو
اس کی پونی ادھر ادھر ہلنے لگی۔ ”کچھ کتابیں کچھ
کاپیاں، کچھ پنسلیں۔“ افتخار علی نے گہرا سانس لیا۔
”ٹھیک ہے بیٹا مگر یہ مشکل مرحلہ ہے۔ میرا
خیال ہے کہ۔۔۔۔۔“

”ابی جان مشکل ضرور ہے نا ممکن نہیں اور پھر
کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے نا۔“ یک
لخت ہی وہ سنجیدہ ہو گئی۔

ابی جان نے بخور اس کا جائزہ لیا۔ سینے پر ہاتھ
باندھے۔ وہ دائیں جانب دیکھ رہی تھیں۔ اس کے
چہرے پر اچانک ہی سنجیدگی کے بادل اترنے لگے
تھے۔ کرمل افتخار علی نے نظریں چرائیں کیونکہ وہ اس کا
دکھ جانتے تھے۔ اپنے دل کو، اپنے خیالات کو، اپنی
سوچوں کو وہ بہلانا چاہتی تھی۔ ایک بھڑے پرے گھر
کے درمیان سے اٹھ کر اس کو بیاباں میں آنا، معنی
رکھتا تھا۔ وہ تو خیر عمر رسیدہ تھے مگر یہ۔۔۔۔۔ ”سر کھما کر
انہوں نے اسے دیکھا جو اپنی چیز سے اٹھ کر ایک
جانب بھاگی تھی۔ انہوں نے اس کے بھاگنے کے
تعاقب میں دیکھا اور سر کرا دیے۔

”کچھ جنگلی خرگوش ادھر آ نکلے تھے۔ سفید اور
چتکیرے، مریم انہیں پکڑنے کے لیے بھاگ رہی
تھی۔ کیسی شوخ و چنچل تھی وہ، فکر و فکر سے بے نیاز۔
اپنے تمام کزنز کے ساتھ کھیلتی اچھلتی۔ شرارتیں کرتی
اور ٹوبان کے ساتھ اس کی جوڑی کتنا چلتی تھی۔ افتخار
علی کا دل اداس ہونے لگا۔

کاش ابرار تم باپ کی خواہش کا ہی پاس رکھ
لیتے۔ ایک بیٹے کو میرے نام، میری خواہش کے نام
کر دیتے تو کیا جاتا تھا ہارا۔ نرم گرم دھوپ میں
انہوں نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

اپنوں کے دکھ نے خون میں حدت سے بھر دی۔
ٹوبان انہیں کتنا عزیز تھا۔ بالکل مریم کی طرح مگر
کالج کے لان کے آخری سرے پر ایک Zoo بنالیں

”تم اکٹا گئی ہو۔“

”نہیں ابی جان۔ میں آپ کی کمپنی میں بالکل نہیں اکٹا گئی مگر آپ کی بزرگی..... اور پھر یہاں گھر جیسا آرام بھی تو نہیں۔“ وہ معصومیت سے کہتی چلی گئی۔

”ہم چوک پر نہیں بیٹھے بیچے۔ یہ بھی گھر ہے۔ تمہاری دادو نے بہت وقت گزارا ہے یہاں اور بے حس اولاد سے یہاں کی تنہائی اور تنگدستی بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کتاب کے اوراق پلٹنے لگے۔

چند ٹاپے سوچنے کے بعد انہوں نے اٹھایا۔ ”مریم ایک کپ کافی لے کر آؤ ذرا اسٹریٹنگ ہو اور سنو اس سے پہلے سیب کاٹ کر آؤ، شہوت ہوں تو لے آؤ۔“ جانتے تھے بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کہے گی۔ ایک گہری نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے مریم اٹھ گئی۔ اپ کچھ بھی کہنا عیب تھا۔

دادا اور پونی ایک دوسرے کی بات بن کہے جان لیتے تھے۔ یہ تو محبت، پیار اور اپنائیت کے انوث رشتے ہوتے ہیں کاش..... کاش..... بس اس کاش پر آکر کرل افتخار علی کی زندگی ٹھہر جاتی تھی۔ ایک دکھ سا پورے وجود میں بکھر جاتا تھا۔ ان کے بچے، ان کی خواہش ہی جان لیتے اور وہ ٹوٹا بان کا بچہ۔ نالائق کہاں گئی دادا کی محبت۔ کیا یہ رشتے ایسے ثانوی اور دکھاوے کے ہوتے ہیں یا وہ بھی ماں باپ کی طرح لاپٹی ہو گیا ہے۔ وہ دیر سے دیر سے چیخ پر جمبولے، نگاہیں غیر مرمی کتے پر مرکوز کیے سارے محبت آمیز منظور کو سوچے جارہے تھے اور آنکھیں غیر محسوس طریقے سے بھیک رہی تھیں۔

مجھے یہاں کے لوگوں سے بات چیت کرنا چاہیے۔ تعلقات بڑھانا چاہئیں۔ ایک بند کمرے میں مریم کے لیے رشتے لگے آئیں گے۔ نئی سوچ نے سر ابھارا تھا۔ مریم ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں یہاں

کچھ سوشل ورک کرنا چاہیے۔ کچھ کام کرنا چاہیے۔ میل ملاپ سے تعلقات بڑھیں گے۔ ان کے اندر امید کی کرن پیدا ہوئی اور یہ امید ہی ہوتی ہے جو آگے بڑھنے کا محرک بنتی ہے۔ یہاں آکر زندگی از سر نو شروع ہوئی ہے تو رشتے بھی از سر نو ہوں گے۔ دیر سے خدا کے کرم کی آس لگا کر وہ اٹھ بیٹھے۔

☆.....☆

”میرا خیال ہے مریم ہمیں پہلے ارد گرد کا چکر لگانا چاہیے۔ میں بوڑھا بیمار آدمی کی وقت بھی بیمار پڑ سکتا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کی کلینک کی، کسی ڈسپنری کی ضرورت ہو سکتی ہے۔“ کرل صاحب نے صبح ناشتے کی ٹیبل پر پرانا اخبار تہہ کر کے ایک سائینڈ پر رکھتے ہوئے مریم کو دیکھا جو لاؤنج میں لگے شیشے کی دیوار کے پار دیکھ رہی تھی۔

صبح کی چمکتی دھوپ تاحند نگاہ تک پھیلے بزم پر بکھری جھکتے ہوئے سونے کی مانند لگ رہی تھی۔ بارش کی کرن من کے بعد دھوپ کا تاثر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ”آج موسم بھی قدرے بہتر ہے۔“ کرل صاحب بولے تھے۔

”صاحب یہ چند دنوں کی دھوپ ہے اس کے بعد بارش اور پھر برف پاری۔ یہ سارا علاقہ برف سے ڈھک جاتا ہے۔ اس طرف پھر کوئی نہیں آتا۔ بہت ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ پھر دھوپ نکلتی ہے تو برف پھلتی ہے، تب زندگی معمول پر آتی ہے۔“ ناظمہ برتن سمیٹتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”ہائے برف باری، اف کتنا مزہ آئے گا۔“ اپنا مگ ٹیبل پر رکھ کر وہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

ہاں آپ لوگوں کے لیے یہ مزہ، سیر تفریح ہے۔ مگر یہاں کے لوگوں کی زندگی کچھ ہو جاتی ہے۔ قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خوراک کا مسئلہ، بیماری، جدائیاں، زندگی، موت سب چار دیواری میں بند ہو

کر رہ جاتے ہیں اور برف پکھلنے کا انتظار کرتے ہیں اور جب برف پھلتی ہے تو.....!!“ بولتے بولتے ناظمہ کا لہجہ آبدیدہ ہو گیا تھا۔

مریم ایک نگاہ دیکھنے جا رہی تھی۔ ”جتنا سحر ہے یہاں تب ابی اور درد بھی ہے۔ شہروں میں اور طرح کے مسئلے ہوتے ہیں، یہاں اور طرح کے مسائل ہیں۔ خوراک، رہائش، بیماری، پیسے کی کمی، بے روزگاری۔“

”پھر یہ لوگ شہروں کی جانب کیوں نہیں چلے جاتے؟“ مریم حیرت سے بولی تھی۔

”شہروں میں اتنی جگہ کہاں رہی۔ یہ لوگ نسلوں سے یہیں آباد ہیں۔ آگے ان کی منزل نہیں۔ مسائل ان کے حل نہیں ہو سکتے اور ذرائع ان کے پاس نہیں۔ آپس میں الجھتے لڑتے جھگڑتے بس یونہی۔“ ناظمہ کی آنکھ پھٹ گئی۔ اسے اپنا کوئی رد یاد آ گیا تھا۔ مریم نے ابی جان کی جانب دیکھا۔ وہ باہر چمکتی دھوپ دیکھتے ہوئے جانے کس سوچ میں گم تھے۔

”پھر یہ یہاں کیا کھاتے ہیں؟“ اس کی حیرت کم نہ ہوئی تھی۔

”خوراک کی کمی کا مسئلہ ہے۔ یہاں درختوں کے پھل برف بن جاتے ہیں۔ کھیتوں کی سبزی برف باری کی نذر ہو جاتی ہے۔ پھر دال چاول، دلیہ اور خشک خوراک پر ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ مرغائیاں، انڈیاں، کبوتر سب ٹھہر کر مر جاتے ہیں دور..... اور جب برف پھلتی ہے تو زندگی ایک نیا سانس لیتی ہے۔“ اک ناویدہ دکھ اس کے لہجے میں بلکوں لے رہا تھا۔

”زندگی میں نئے دور آ جاتے ہیں۔ پورا علاقہ ہیل بن جاتا ہے۔ جگہ جگہ جی ہوئی برف پھلتی ہے اور پانی نیچے نشیب کی جانب بہنے لگتا ہے۔ سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ لوگ تیز دھوپ کی دعا میں

مانگتے ہیں تاکہ سلیمن ختم ہو، پانی سوکھے اور مرد روزگار کے سلسلے میں باہر نکلیں، بیماروں کو گرہائش ملے۔ ٹھنڈک اور سردی ختم ہو۔“

مریم دم بخود سستی جا رہی تھی۔ ابی جان بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک کرب اس کے چہرے پر تھا۔ مریم کو اس کا درد اپنے دل میں محسوس ہوا۔ ناظمہ برتن سمیٹ کر چلی گئی۔

”ابی جان ہمیں ان کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ایک لائیکل ترتیب دے کر ان کی مدد کرنا چاہیے اور ہم نے کیا کرنا ہے۔ ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے۔“ اس نے دادا سے اپنا دکھا کہا۔

”ہوں۔“ انہوں نے ہلکے سے ہنکارا بھرا۔

”جو ہمارے اختیار میں ہے ہم وہ تو کر سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ ابی جان نے بنور اس کی جانب دیکھا۔ مریم نے نظریں چراغیں اور شاید ہمارا یہاں آنے کا مقصد ہی یہ ہے۔“ سگار ہونٹ میں دبا کر کرل افتخار احمد اس کے عقب میں نظر آتے منظر کو دیکھنے لگے۔ اس وقت چمکتی دھوپ میں بزم گھاس پر سفید کبوتر، مرمی کوئل اور سیاہ کوئے آکر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ ان کے عقب میں پولکٹس، سفیدے اور پائن کے درختوں پر ابا بیلوں نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ رات کو یہاں سے جتنا گھور اندھیرا بھانک لگتا تھا اس وقت منظر اتنا ہی خوب صورت اور دلکش لگتا تھا۔ مریم نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور مسکرا دی۔

”میری بھی فریاد سن لیں میری بھی دادی کی کر دیں۔“

”جانے، تیری سنی گئی ہے، جاتیاری کر، ہم باہر نکلتے ہیں۔“ کرل صاحب نے شاہانہ انداز میں کہا اور مریم کو نوش بجالائی۔

Confession..... اعتراف

☆☆☆

اضطراب کی بے چین وادیوں میں
زیست کی بے کنار تہائیوں میں
دیکھو خزاں کوئی رستہ بھولا ہے
خود کو ہمزاد ہمارا بتلاتا ہے
خیال کی منڈیروں پہ دیے جلائے
آگ میں اپنی خودی جلتا ہے
پہاڑوں کے سبز نقشِ سفر پہ
بھول سارے وہ جنگلی ٹھنڈا ہے
یونہی ایک دن
چلتے چلتے
باتیں کرتے
سفر کی روانیوں میں
وقت کی نشانیوں میں
بات کی حیرانوں میں
حرفِ ابجد میں کھلا ایک درملا ہے
لوہِ دل پہ لکھا صرف ایک نام ملا ہے
وہ نام تمہارا ہے
جواب میرا ہے.....

☆☆☆

نگہت نسیم۔ سڈنی

کے سر پر ارد گرد جنگل سے چنی ہوئی سوکھی لکڑیوں کا
ڈھیر تھا۔

”اے سنو۔“ مریم نے آواز دی۔ انہوں نے
گھوم کر دیکھا تو اس نے اشارے سے انہیں بلایا۔
”یہاں کوئی ڈاکٹر ہے۔ کلینک یا اسپتال۔“
”نہیں۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر
انکار میں سر ہلایا۔

”کوئی اسکول۔“ اب کے دونوں لڑکیاں ایک
دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

”نہیں۔“ پھر سے انکار میں سر ہلایا گیا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے محبت سے
پوچھا۔

”میرا نام زیتون ہے اور اس کا نگار۔“ گلابی
کپڑوں والی لڑکی شرماتے ہوئے بولی۔

”میرا نام مریم ہے یہ جو اوپر چبچے سفیدے کا
درخت نظر آ رہا ہے، یہاں ہمارا کانچ ہے۔ تم آنا
ادھر۔“ مریم نے انہیں گھر کا راستہ بتایا۔

”پڑھو گی۔“ اس نے نگار کی جانب دیکھا۔
”آپ پڑھاؤ گی ہمیں۔“ زیتون کی آنکھوں
میں چمک ابھری۔

”ہاں! تم آنا کتابیں بھی دوں گی اور کاپیاں اور
پنسلیں بھی ہیں میرے پاس۔“

”رنگ برنگی پنسلیں بھی ہیں۔“ نگار کی آنکھوں
میں شوق تھا۔

”ہاں وہ بھی ہیں تم آنا۔“
”اے بڑا شوق ہے کاغذ پر چیزیں بنا کر رنگ
بھرنے کا مگر.....“ کہتے کہتے اس نے دل مسوس کر
کے اسے دیکھا۔

”تم آنا اور کوئی بھی پڑھنا چاہے تو اسے بھی
لے آنا۔“ مریم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ابی
ہاں آگے کل گئے تھے۔ ”ٹھیک“ یہ کہہ کر وہ آگے

”اگر یہ لوگ آٹھ بجے میرے پاس آ جاتے ہیں
تو میرے خیال میں دس بجے میں ان کو فارغ
کر دوں۔ واپسی پر یہ لوگ فروٹ توڑتے، جمع
کرتے ہوئے چلے جائیں اور پونے بارہ کے
بجائے بارہ ساڑھے بارہ بجے جاسکتے ہیں، اپنی
مزدوری کے لیے۔“ مریم نے فخریہ نگاہوں سے سر
گھما کر انہیں دیکھا۔

”ذہن دادا کی ذہن پوتی۔“ کرنل صاحب
ہنس دیے۔

”سوال یہ ہے۔“ ایک موڑ مڑتے ہوئے
انہوں نے کہا۔ ”تم آٹھ بجے آٹھ جاؤ گی۔“

”اوہ۔“ مریم نے سر کھجایا۔ ”یہ ایک نیک مقصد
ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھے آٹھ جانا چاہیے اور پھر
آپ ہیں نا۔ وہ شرازت سے ہنسی مچی۔

”کیا مطلب۔“ وہ ٹھٹھک کر رکے۔
”میرا مطلب ہے کہ مجھے اٹھانے کے لیے۔“

اس نے جملہ مکمل کیا۔
”ہوں۔“ قدم آگے بڑھاتے ہوئے انہوں
نے کہا۔ ”میں سب کچھ کر دوں گا مگر مجھ سے بچوں کو
پڑھانے کی امید مت رکھنا۔“ کرنل صاحب نے ارد
گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اسے وارن کیا۔

”پھر آپ نے اپنے چھ بچوں کو کیسے پڑھالیا۔“
اس نے اپنی بات سے خود ہی حقا اٹھایا۔ جواب میں
انہوں نے اسے گھورا۔

”وہ میرا نہیں تمہاری دادی کا مسئلہ تھا۔“ اور پھر
وہ ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ مٹی کے کچے کچے
مکانات ہاتھ سے بنے ہوئے تھے۔ کوئی پلستر نہیں کیا
گیا تھا اور کوئی مکان پکا نہیں تھا۔ کچھ کچیریل کی
ترجمی چھتوں والے مکان تھے، جن پر ٹاٹ کے
پردے بھول رہے تھے۔ دو نو عمر لڑکیاں ہنستی ہوئی
ان کے قریب سے انہیں دیکھتی ہوئی گزر گئیں۔ ان

دونوں تیار ہو کر باہر نکلے۔ ارد گرد کا جائزہ لیتے
یہ دونوں نشیب کی جانب چلنے لگے۔ آگے کو کچھ بچے
سر پر چھابڑیاں رکھے جا رہے تھے۔ کول بڑی بڑی
چھابڑیوں میں شہتوت، لوکاٹ، کالے مسالے
والے پنے تھے، جسے لوگ نیچے اسٹاپ پر بیچنے
جا رہے تھے۔ سختی بہادر بیچے ابھی سے روزگار کے
سلسلے میں پریشان۔ مریم نے ترم نگاہی سے انہیں
آگے آگے جاتے دیکھا۔ کچھ چھابڑیوں میں کچے
امردو تھے۔

ایک بچے کو روک کر اس نے مسالے کے ساتھ
امردو خریدے اور پھر امردو کترتے ہوئے آگے
بڑھنے لگی۔

”ابی جان، اسی وقت دن کے گیارہ بج رہے
ہیں۔“ اس نے دادا سے کہا۔

”نہیں پونے بارہ۔“ سر پر ٹوپی ٹھیک کرتے
ہوئے کرنل صاحب نے کہا۔

”جی پونے بارہ۔“ سر گھما کر اس نے انہیں
دیکھا۔ سر پر ٹوپی بلیک ٹراؤڈر، سرخ شرٹ میں
اسٹنک پکڑے دوسرے ہاتھ میں سگار لیے ادھر
ادھر دیکھتے۔ اسٹنک جما کر چلتے دراز قد ابی
جان پر اسے بے ساختہ پیارا آ گیا۔ اس نے سسکرا
کر منہ پھیر لیا۔

”یہاں کے لوگ علی الجح اٹھنے کے عادی ہیں۔
صبح آٹھ کر کیا کرتے ہوں گے یہ۔“ ادھر ادھر کھیل
تماشے وقت کا زیاں ہے۔ ان لوگوں کو تعلیم اور
تربیت دینی چاہیے۔“ کرنل انخار نے ترجمی نگاہوں
سے اسے دیکھا۔

”یہ جو بیچنے کا سامان بھل وغیرہ لے کر جا رہے
ہیں اس وقت یہ لوگ یہ سب جمع کرتے ہیں۔“ سگار
منہ سے نکال کر انہوں نے انگلی سے ان کی جانب
اشارہ کیا۔

بھاگی۔

”ٹھیک ہے۔“ نگار نے سر ہلایا۔ اس کا گھڑ
نیچر گر گیا تھا۔ دونوں لڑکیاں پھر سے ایک دوسرے کو
دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

انہوں نے جہاں تک ہمت تھی وادی کا چکر لگا
لیا۔ یہاں پر غربت، بھوک، مظلوم الحالی کی
بہتات تھی اور ایک بات کا اور ان پر انکشاف ہوا کہ
یہاں کے لوگ اپنی مدد آپ کے تحت زندگی گزارتے
ہیں۔ ان کے آباء اجداد نے اتنا نہیں چھوڑا تھا کہ
اس پر انحصار کیا جائے۔ غربی نسل در نسل چلتی آرہی
تھی اور گڑھا کھودنے اور روز بانی بھرنے والی مثال
تھی۔ صبح کاتے، رات کو خرچ کر دیتے تھے اور رات
کو لائی ہوئی اجرت صبح ختم۔

☆.....☆

”ابی جان! یہاں بخیر ہاسپتال کے، بنا کسی
ڈاکٹر کے یہ لوگ کس طرح سے زندگی گزارتے
ہیں۔ یہ لوگ بیمار بھی ہوتے ہیں۔ شہنڈ بھی لگتی ہے۔
آج کل سردی لگتی ہو رہی ہے۔“ مریم کو دیکھتے
ہوئے ناظمہ مسکرا دی۔ کرنل صاحب نے مچھری
کھاتے ہوئے ترجمانی نگاہ اس پر ڈالی۔

”بہری فقیری، حکمت، جڑی بوٹیاں، جو
شاندے ان کی صحت کا راز ہیں بیٹا۔“ انہوں نے
منہ میں نوالہ بھرتے ہوئے کہا۔ مریم ان کی شکل
دیکھنے لگی۔ ”یہاں پر حکیم، جراح، ڈاکٹر کے فرائض
سر انجام دیتے ہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لیتے
ہوئے کہا تھا۔

”خدا ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق
سہولیات فراہم کر دیتا ہے۔“ ان کی بات سن کر وہ
اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

”کل بازار چلیں گے۔ کچھ چیزیں لیتی ہیں۔
اخبار رسالے بھی لیں گے۔“ کرنل صاحب نے پانی

کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔

”ابی جان شکر ہے کہ میں اپنا کمپیوٹر ساتھ لے
آئی تھی۔ مجھے اخبارات وغیرہ کی کسی اتنی محسوس نہیں
ہوتی۔“ اس نے شکر کا سانس لیا تھا اس کا میا بی پر۔

”اور شکر ہے کہ میں اپنا چھوٹا ٹی وی سیٹ ساتھ
لے آیا تھا مگر اخبارات، رسائل، میگزین وغیرہ کی
اہمیت اپنی جگہ مستحکم ہے۔ مطالعہ کی اہمیت سے انکار
نہیں ہے۔“

مریم کچھ جھل سی ہو گئی۔ وہ مطالعہ کی چور بھی۔
اخبار پر سرسری سی نظر ڈالتی تھی۔ سارا کام کمپیوٹر پر
کر لیتی تھی۔ گریجویٹن میں اس کے پاس کمپیوٹر تھا
اور ٹوبان نے اسے اس میدان میں ماسٹر کر دیا تھا اور
یوں مختصر کورسز کی اسے ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔
ہاں گریجویٹن کرنے کے بعد ایک ڈپلومہ ضرور کیا
تھا۔ جاب کرنے کی خاطر۔ فارغ پختے سے بہتر ہے
کہ بندہ کچھ کر لے۔ یہ اس کا ذاتی خیال تھا اور وہ
اس پر عمل درآمد بھی کرتی تھی۔

”سنو جاب کے لیے ماری ماری مت پھرنا۔
انٹرویو کے لیے میرے آفس میں آ جانا۔“ اس کا
جاب کے بارے میں خیال سن کر ٹوبان چپکا تھا۔

”تمہارے آفس میں۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔
”ہاں! میرے آفس میں۔ بنا کسی تجربے
کے اوکے کر دوں گا۔ آخر میں ہوں نا تجربہ کار
بنانے کے لیے۔“ ٹوبان نے فرضی قابلیت کے
کار جھاڑے تھے۔

”مگر تم تو ابھی خود اپنے پاپا کے دست مگر ہو۔“
”تو کیا ہوا۔“ اس نے ایک ادا سے بالوں میں
ہاتھ پھیرا۔ ”کل میرا ہی تو ہے۔“
”اونہ۔“ مریم نے سر جھٹکا۔

”ویسے میرے دل کے آفس میں صرف تمہارا
ہی اپنا کمنٹ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مزید پھیلا۔ ”کیونکہ

میرا دل کہتا ہے کہ تم سکھ، سلیقہ مند اور قابلیت رکھتی
ہو۔“

مریم نے کٹن اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔
”بلا جھک منہ دھور کھو۔“

”ابھی نہا کر آیا ہوں۔“
”اوہو۔“ وہ ہنسی۔ ”مگر جراثیم نہیں گئے

ہیں۔“ اس نے شرارت سے اسے دیکھا تو ٹوبان
”خو کر رہ گیا۔“

ٹوبان اور مریم میں تھوڑا سا ہی فرق تھا۔ ایک
دوسرے سے دوستی بھی بہت تھی اور لڑائی اس سے
بڑھ کر ہوتی تھی اور لڑائی میں ہمیشہ ابی جان صلح
کراتے تھے۔ تمام نواسوں پوتے پوتیوں میں انہیں
بھی ٹوبان سب سے عزیز تھا۔ پیارے تو سب ہی
لگتے تھے مگر ٹوبان دل کے قریب تھا۔ اس کا بھراور
اس کا درد دیکھا تھا، جب روڈ پر کرکٹ کھیلتے ہوئے
اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ دس دن آئی سی یو
میں رہا تھا اور وہ دن قیامت کے تھے۔ اس کے لیے
خصوصی دعا میں مانگی گئی تھیں۔ صدقے، خیرات
کے گئے تھے مگر اب..... کرنل افتخار احمد اکثر گہرا
سانس لے کر رہ جاتے تھے۔

”ظالم بچے بنے کر خبر ہی نہیں لی کہ اس
کے ابی جان کس حال میں ہیں۔ اس کے بغیر کیسے رہ
رہے ہیں۔ جنگل بیابان، میں کسی چیز کی ضرورت ہو
گی۔ ڈاکٹر سے ماہانہ چیک اپ کیسے ہوگا۔ یہ علاقہ
کچھ دن کی تفریح، بے درد سیاحت کے لیے تو ٹھیک تھا
مگر مستقل رہائش کے لیے ناممکن مگر رہ رہے تھے وہ
دونوں اولاد نے بھی نہیں پوچھا تھا۔ سب کے فون
آئے تھے ایک ایک بار مگر سب ٹھیک ہے کہہ کر فون
بند کر دیا جاتا تھا۔ وہ اندر سے اپنی اولاد سے خفا اور
ناراض تھے۔ کیا تھا اگر ایک بیٹا، باپ کے نام پر
قرہاں کر دیتے مگر لالچ، طمع، ہوس انسان کتنا بھٹکا

ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اکثر ان کی سوچ
کہیں کی کہیں سفر کر جاتی تھی۔

☆.....☆

اگلے دن دادا بوتی چندو میٹر کا قافلہ طے کر کے
شہر سے ابتدائی انکس اردو کی کتابیں، کاپیاں،
پنسلیں، بکرنسلیں اور بڑے آئے۔ ابی جان نے
اخبار اور رسالوں کا پلندہ بھی خریدا۔
”اتنا کچھ۔“ مریم نے حیرانی سے ان کے
بندل کو دیکھا۔

”اپنے بندل کو دیکھو، میرے ڈبے کو نظر مت
لگاؤ۔“

”پھر ابی جان میں یہ دو بھاری بھاری بندل اٹھا
کر کیسے لے کر جاؤں گی۔ پہلے بھی میں آپ کے
ردی رسالے لے کر آئی تھی اتنی چڑھائی ہے۔“ اس
نے اپنے شانے دہاتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا خیال ہے۔“ انہوں نے تجاہل عارفانہ
پوتی کو دیکھا۔

”اس بندل کی پے منٹ کر دوں۔“ انہوں نے
اس کے پیکٹ کی جانب اشارہ کیا۔

”کریں نا۔ میرا بینک اکاؤنٹ تو آپ ہیں۔“
وہ ہنسی ہوئی۔

”اٹھا لو گی؟“ اسے بلیک میل کیا گیا۔
”اور کون اٹھائے گا میرا بوجھ۔ اپنا بوجھ انسان کو
خود ہی اٹھانا ہوتا ہے۔“ ایک رسالے پر نگاہ پڑی تو
وہ اسے اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”تو میرا بھی اٹھا لو گی نا۔“ انہوں نے سنجیدگی
سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔
”جی! یہ دونوں بندل آپ نے اٹھائے ہیں اگر
نہیں اٹھا سکتی ہو تو اپنا بندل کھلوادو۔“ کرنل صاحب
نے شفاف اردو میں کہا اور منہ پھیر لیا۔

”ابی جان“ وہ بھڑک ہی تو اٹھی تھی۔
 ”ابھی کھانے پینے کی اشیاء بھی لینا ہیں۔“
 انہوں نے جیسے اسے ڈرایا۔ اس کی آنکھیں ٹھل گئیں۔

”تمہیں تو معلوم ہے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔
 کہاں وزن اٹھا سکتا ہوں۔“
 مریم نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا جو کل تک کہتے تھے فوجی نہ جھٹتے ہیں، نہ بوڑھے ہوتے ہیں۔
 ان کے دل جوان ہوتے ہیں۔ کرنل افتخار کے چہرے پر دہلی دہلی مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے چھیڑ رہے تھے اور دکا انداز میں رہا تھا۔

”میں صعب نازک ہوں۔ اتنا سامان میرے اوپر بوجھ ہوگا اور یہ ظلم ہے۔“ اس نے دہائی دی۔
 ”اور جو خود کو فوجی کی بیٹی اور فوجی کی پوتی کہتی ہو۔“ انہوں نے گھورا۔

”تو اس میں کیا شک ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے انہیں چڑانے لگی۔
 ”وہ تو میں ہوں۔“

کرنل افتخار ہنس دیے۔ مریم کھلکھلا دی اور پھر انہوں نے بازار سے واپسی پر فٹ پاتھ سے چنے کی چاٹ کھائی۔ اس کس کریم خریدی، سامان دکان میں ہی رکھوا کر پورے بازار کا ایک چکر لگایا۔ چند اور ضرورت کی چیزیں خریدیں اور پھر بیٹا کھاتے ہوئے وہ کرنل صاحب کا دامغ بھی کھاتی رہی۔

☆.....☆

”ناظمہ بچوں کو لاؤ تا پڑھانے کے لیے۔“
 اگلے دو دن تک انتظار کرنے کے بعد آخر اس نے ناظمہ سے کہا۔

”ہاں میں کل نیچے وادی میں جاؤں گی تو بچوں کو بتاؤں گی جن کو شوق ہوا وہ آجائیں گے۔“
 ”مریم!..... مریم!“ باہر لان سے کرنل افتخار

پکار رہے تھے۔

”جی ابی جان۔“ کچن کی بڑی سی کھڑکی سے اس نے باہر کی جانب دیکھا۔ جہاں سے داخلی گیٹ بھی نظر آرہا تھا۔ دو بچے ہاتھ میں خرکوش پکڑے کھڑے تھے۔ نیکین سے ہاتھ صاف کرتی وہ باہر بھاگی۔ ”تمہارے خرکوش آگئے ہیں۔“ ناظمہ بھی ان کے پیچھے کھڑی ہوگئی تھی۔ دونوں لڑکوں کے ہاتھ میں چار چھوٹے چھوٹے خرکوش تھے۔ سفید رنگ کے۔ دو کی آنکھیں سرخ اور دو کی کالی سیاہ تھیں۔ ایک کو پکڑ کر اس نے کود میں بھرایا۔

”یہ سلیم ہے اور یہ شفیق، میرے بھائی کے بچے۔ میں نے انہیں کہا تھا خرکوش لانے کے لیے۔ بچے ہیں یہ بچے جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ جنگلی خرکوش تھے وہ جنگل میں ہی خوش رہتے، انہیں گھر کا ماحول لے گا تو یہ مانوس ہو جائیں گے کہیں جائیں گے، نہیں۔“ ناظمہ شوق سے بتا رہی تھی۔

”جاشفیق اس کو نے میں ادھر دیوار کے ساتھ ان کا بچہ رکھ دے اور پانی کا انتظام بھی کر دے۔“
 ناظمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا چھوٹی۔“ دونوں بائیں جانب چلے گئے۔
 مریم دو خرکوشوں کو کود میں رکھے انہیں پیار کر رہی تھی۔ ابی جان نے اس پر نظر ڈالی اور پھر دوبارہ سے پودوں کی کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔
 ان کا یہ چھوٹا سالان سنور گیا تھا۔ پھولوں کی کیاریوں میں جو بیج ڈالے تھے ان سے کوئلیں پھوٹ پڑی تھیں۔ بوکن دلیلا اور پائٹن کی بلیں، اب دیواروں پر رسی کے سہارے چڑھ رہی تھیں۔ اس میں مریم اور کرنل افتخار علی دونوں کا حصہ تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ دھوپ سینکنے کے بہانے ادھر ہی گزارتے تھے۔ ایک پتھر دکان ہو جاتے تھے۔
 مریم نے پوکپوکس، پائٹن اور کھجور کے درخت

کے نیچے گھاس اگانے پر زیادہ توجہ دی تھی۔ دائیں جانب کی دیوار کو بلیک کمرے سے پیٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ مقام اس اسکول کی جگہ تھی جہاں بچوں نے آکر پڑھنا تھا۔ بلیک بورڈ کے بائیں جانب دن کا راجہ اور رات کی رانی کی باڑیں تھیں۔ مسور کن خوشبو نضا میں مہکتی رہتی تو رات کو ہوا کے دوش پر اڑتی، لہراتی، رقص کرتی درپچوں اور دروازوں سے اندر آ جاتی تھی۔

”ناظمہ ان بچوں سے پوچھو کہ پڑھیں گے۔“
 مریم نے تیز کام کرتے شفیق اور سلیم کی جانب اشارہ کیا۔

”ان کا بابا بیمار ہوتا ہے۔ دونوں چھابڑی لگاتے ہیں تو کچھ دال دلیہ ہو جاتا ہے۔“

”مگر ناظمہ جب تک یہ پڑھیں گے نہیں تو ترقی کیسے کریں گی۔ کیا یہ ساری عمر چھابڑی لگاتے رہیں گے یا بہت ہوا تو چھابڑی سے ریڑھی تک ترقی کر لیں گے۔ اس سے کوئی بہتری تو نہیں آئے گی نا۔“ اس نے فلسفہ جھاڑا۔

”کوئی دوسرا کام نہ والا ہو تو کچھ کریں نا۔“
 ناظمہ نے مجبوری بتائی۔

”ان کو زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ ان کا باپ بیمار ہے تو آگے چل کر گھر کے کمانے والے بھی رہی ہوں گے۔ کیا کرتا ہے تمہارا بھائی۔“ اس نے ناظمہ سے پوچھا۔

”پچھل فردٹ کا ٹھیلہ لگاتا ہے۔“ ناظمہ نے سر جھکا لیا۔

”وہ ٹھیلہ ان بچوں کو منتقل کر دے گا۔“ مریم کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

”کیا کریں جی۔ یہاں کے موسم، حالات، مہنگائی اور بیماری پھر زیادہ بچے..... بس پھر یہی ہوتا ہے یہاں۔“

ملینہ

بستہ پھینک کے لو جی بھاگا

روشن آ رہا بغ کی جانب

چلتا، ”چل گڈی، چل

کے جاسن ٹپکس گے“

آنگن کی رسی سے ماں نے کپڑے کھولے

اور تھوپ لاکے ٹین کی چادر ڈالی

سارے دن کے سو کھے پا پڑ

پھی نے چادر میں لپیٹے

”بچ گئی رہا! کیا کرایا دھل جاتا تھا“

خیر نے اپنے کھیتوں کی سوکھی مٹی

جبر یوں والے ہاتھ میں لے کر

ہیکلی ہیکلی آنکھوں سے پھر اوپر دیکھا

جھوم کے پھراٹھے ہیں بادل

ٹوٹ کے پھر مینہ بر سے گا

گلزار

مریم تاسف اور ملال سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
”کل تم گھر جانا اور اپنے بھائی کو سمجھانا۔ یہ لڑکے سمجھدار ہیں، کچھ پڑھ لیں گے۔ زیادہ نہیں بس اردو لکھنا اور پڑھنا آجائے، حساب کتاب سمجھ لیں تو زیادہ اچھا کام کر سکتے ہیں۔ کسی دکان میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ منڈی میں بھاؤ تاؤ کر سکتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا کوئی بھی اچھا کام کر کے زیادہ اچھا کام کر سکتے ہیں۔“

ناظمہ ہونٹوں کی شکل دیکھنے لگی اور ابی جان نے ہاتھ روک کر اپنی ذہن پونی کو سراہنے والے انداز میں دیکھا۔

”بات کرنا تم بلکہ ایسا کرو کہ تم انہی کے ساتھ چلی جاؤ۔ کل آجانا اور انہیں بھی ساتھ لے کر آنا صبح دو گھنٹے پڑھ لیں بس کافی ہوں گے۔“ مریم نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کر کے ٹائم ٹیبل بھی ترتیب دے لیا۔

”اور بچے کون سا صبح صبح کام پر چلے جاتے ہیں۔ لے کر آنا انہیں کتابیں، کاپیاں میں دوں گی۔ بس یہ آجائیں۔“ اس نے پھر اصرار کیا اور ناظمہ سر ہلاتی اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

ایک خرکوش پھد کر اس کی کود سے نکلا اور بھاگتا ہوا شفیق کی جانب چلا گیا۔ اسے جاتے دیکھ کر دوسرا بھی چلنے لگا۔ مریم نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے چھوڑ دیا اور وہ دوڑتا ہوا اپنے ساتھی کے پاس پہنچا۔ چاروں بچہ بچہ میں بند ہو گئے۔

”یہ بھائیوں کے تو نہیں؟“ اس نے شفیق سے پوچھا۔

”نہیں یہ اپنے بچہ سے مانوس ہیں۔ ادھر ادھر کھیلیں گے۔ پھر ادھر اہوتے ہی ادھر آجائیں گے۔ آپ انہیں دانا پانی، ان کی پسند کی خوراک دے کر ان سے دوستی کر لیتا، پھر یہ کہیں نہیں جائیں

گے۔“ شفیق نے بتایا۔

دونوں بچوں کے حلیے میلے کچیلے ہو رہے تھے۔ بالی بڑھے ہوئے تھے۔ غربت چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ افلاس جن کے گھر کا رستہ دیکھ لے وہاں سے غربت جاتی ہی نہیں۔ مریم کو بہت ملال ہوا۔

”پڑھو گے؟“ اس نے شفیق کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بارہ چودہ سال کا بچہ اس کی جانب دیکھ کر بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ابا سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“ بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

”ابا سے کیوں.....“ اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر انہیں دیکھا۔ میٹالے سے رنگ کے کپڑے، قدرے اونچی کی ہوئی شلوار، میلے کچیلے پیروں میں کالے رنگ کی چپل۔

”پڑھنا تمہیں ہے، شوق تمہیں ہے۔ پڑھائی تمہارے کام آئے گی۔“ اس نے بچوں کو جذباتی طور پر ایسٹبل کیا۔

”تمہیں شوق ہے پڑھنے کا۔“

”ہے جی کیوں نہیں۔ بچپن میں مجھے جہاز چلانے کا اور اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا مگر.....“ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔

”تجارت نہیں غریبوں کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ جب وسائل نہیں تو اتنے بچے پیدا کیوں کرتے ہیں۔ وقت سے پہلے اپنے بچوں کو بڑا کیوں کر دیتے ہیں۔ نہ وہ اپنا بچپن بچوں کی طرح گزارتے ہیں، نہ جوانی جوانوں کی طرح۔ ایک دم سے تفکر اور فکر فردا کے بادل لے کر بڑھاپے میں گھس جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی تھی کیونکہ شفیق کا باپ کمزور ناتواں بیمار تھا۔ اب اس کی جگہ بچے کمانے جارہے تھے۔

”اب تم پڑھ سکتے ہو۔“ اس نے ان کے

چہروں پر لکھا تذہب پڑھ لیا۔ ”میں تمہارے ابا سے بات کروں گی۔ تمہاری پھوپھو کو اس لیے ابھی تمہارے ساتھ بھجوا رہی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

”جی؟“ شفیق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”جی۔“ مریم نے اس کی ناگ دبائی۔

پڑھائی کا شوق ان کی آنکھوں سے ہویدا تھا اور مجبور یوں کے بندھن پیروں سے لپٹے نظر آ رہے تھے۔ ناظمہ ان کے ساتھ چلی گئی۔

☆.....☆

موسم آج کل بہت سرد ہو رہا تھا۔ پہاڑی علاقہ تھا اس لیے سردی زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ ابی جان روکنگ چتر پر آتش دن کے قریب بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں موٹی سی کتاب بھی شاید مستنصر حسین تارڑ کا کوئی سفر نامہ تھا۔ وہ خود بھی کپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئی۔

فضا میں گہری خاموشی تھی۔ پہاڑی کوئے بھی بہاروں کی سیاحت کے بعد پھیل کے بیڑ پر جو استراحت تھے۔ تاہم باہر کی دنیا میں مینڈک کی ٹراہٹ اور جھینگروں کی موسیقی تھی۔ خاموش ساکت دنیا میں ایک مخصوص سادہم تھا جو باہر نکل کر سنا جاتا تو اچھا خاصا خوفناک تھا۔

☆.....☆

ناظمہ ایک دن بعد آئی اور اپنے ساتھ بہت سارا سامان، طعام اور مہمان لائی جنہوں نے اب ادھر کے رہائشی بننا تھا۔ طعام میں برسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی، میٹھی گندم اور تیل کے لٹو میوے والا گڑ اور شکر کی جسے پاکر ابی جان کی تو عیدی ہو گئی تھی۔

ساتھ میں وہ چھوٹے چھوٹے مرنے کے بچے اور کبوتر لائی تھی۔ مریم اچھل ہی تو پڑی۔ سرخ ببرز براؤن پیلے چوڑے چوں چوں کرتے ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔

”کل ہی انڈوں سے نکلے تھے۔ آدھے میں لے آئی آدھے ادھر ہی ہیں اور ابا گاؤں سے آیا ہوا تھا، اس لیے ساگ اور مکئی کا کھانا لے کر آئی ہوں۔“

”ناظمہ بھائی سے بات کی؟“ مریم نے کل والی بات کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں میں نے بھائی سے بات ہی نہیں کی بلکہ انہیں سمجھایا بھی۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے۔ بچے پڑھیں بھی، کمائیں بھی۔ بھائی کو اور کیا چاہیے۔“ ناظمہ نے خوش خبری دی۔

”پھر دو چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ اسکول میں تین بجے پچھی ہوئی ہے۔ اسکول نیچے اتر کر دو اسٹاپ کے بعد جو گاؤں آتا ہے ادھر ہے۔ گھر آتے آتے چار بج جاتے ہیں۔ سارا دن غرق، اس لیے بھائی اسکول داخل نہیں کر داتا۔“ ناظمہ نے تفصیل بتائی۔

”میں ان چوڑوں کو لے کر آئی ہوں مریم بی بی مگر سردی بہت ہے اور آنے والے دن برفباری کے ہیں اور انہیں گرمی کی ضرورت ہے۔“

”تم ان کا پنجرہ لانا ہو؟“ سرخ رنگ کا پھولا پھولا چوڑہ اس نے پھیلی پر لے لیا۔

”ہاں جی وہ تو لائی ہوں۔“

”بس آج سے یہ چھ کے چھ چھوٹے ہمارے ساتھ، اس کمرے میں رہیں گے اور ان کی جگہ آتش دان کے قریب ہوگی اور تم روزانہ کا پنجرہ ادھر ہی صاف کر دینا۔“ اس نے مسئلہ حل کیا۔

ابی جان اس کا شوق اور دلچسپی انتہائی غور سے دیکھ رہے تھے۔ مریم نے اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈ لی تھی۔

بچے صبح پڑھنے آجاتے۔ وہ جاتے تو ان جانوروں کی مصروفیت تھی اور وہ بہت خوش تھی مگر وہ اس خوشی کے ساتھ ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی تھی۔

ایک اضطراب سا ان کے وجود میں سرایت کر گیا۔ اسے ایک گھر، ایک تحفظ، ایک ساسھی کی ضرورت تھی۔ ان کی زندگی کب تک تھی؟ اور کب تک وہ ان کے ساتھ رہ سکتی تھی؟ شادی کے دن یہ ہی تو تھے۔ انہوں نے ایک ماں کی نظر سے جھکتے چہرے والی مریم کو دیکھا۔ دن ڈھلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ شام ہی تو ہے۔ کیا کریں۔ دیر سے اٹھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مریم دادا کے مضطرب وجود کو محسوس ہی نہیں کر سکتی تھی۔

☆.....☆

اگلے دن سے سلیم اور شفیق پڑھنے کے لیے آگئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا اور تھاراجو۔ اس نے انہیں کاپیاں، کتابیں، پنسلیں دیں اور بڑی محبت سے پڑھایا۔

”باجی میرے ساتھ، میری بہن بھی ضد کر رہی تھی آنے کی۔“ راجو نے پنسل سے ”ج“ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”تو لے آؤ بیٹا نہیں بھی۔ وہ بھی پڑھ لے۔ کل ضرور لے کر آنا۔ کیا نام ہے اس کا۔“

”یا سکین۔“ راجو نے جھٹ بہن کا نام بتایا۔

”اور سلیم تمہاری بہن نہیں ہے۔“

”میری چار بہنیں ہیں۔ گھر کے کام کرتی ہیں۔ اماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ان کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔“

سلیم نے مجبوری بتائی۔

”تو تم دو بہنوں کو صبح اپنے ساتھ لے آیا کرو۔ دو دو پہر کو آ جایا کریں گی۔“ شفیق ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کام کرو۔ توجہ سے۔“ اس نے ڈنپا۔

”میں اماں سے کہوں گا۔“ سر جھکا کر وہ سش لکھنے لگا اور ایک سرخوشی مریم کے وجود میں سرایت کرنے لگی۔ تنگی کرنے کا احساس ہی کچھ اور ہے۔

☆.....☆

کرل افتخار احمد صبح داک کے لیے نکلے تو دوسرے بنے ہوئے کالج کی جانب آ نکلے۔ اس سے پہلے وہ اس طرف بھی نہیں آئے تھے مگر اب مجبوری تھی۔ اب شاید کوئی ٹیلی ہو، شاید کوئی امید کی کرن ہو اور شاید ان کی مراد بر آئے۔ جذبے سچے ہوں تو خوشی مل ہی جاتی ہے۔

سبز رنگ کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کے قدم رک گئے۔ ایک مرد اور عورت کھڑے تھے۔ کرل افتخار نے رک کر ان سے مصافحہ کیا۔

”میرا نام کرل ریٹائرڈ افتخار احمد ہے۔ وہ سفید کالج پینل کے درخت والا میرا ہے۔“

”میرا نام محمد لغاری ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ ہم لوگ یہاں چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارا بیٹا عمر بھی ہے۔ وہ امریکہ سے آیا ہے۔ یہاں شمالی علاقہ جات کی سیر کرے گا۔“

”ہوں۔“ افتخار احمد اندر سے خوش ہو گئے۔ امید کا ایک در کھلا تھا۔

”میرے ساتھ میری پوتی ہے مریم، آئیے گا نا ہمارے گھر۔“

”ضرور ضرور۔“ انہوں نے اپنی بیگم کو دیکھا۔

”ذرا گھر وغیرہ سیٹ کر لیں۔“

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔۔۔۔۔“ کرل صاحب نے غصانہ آنکری۔

”نہیں ہمارے ساتھ ہر چیز ہے۔ منرل واٹر، خشک خوراک کا ذخیرہ وغیرہ وغیرہ۔“ وضاحت پیش کی گئی تھی۔

”او کے۔“ کرل افتخار دوبارہ آگے بڑھ گئے تاہم ان لوگوں کو دیکھ کر اب انہیں کچھ تسلی ہونے لگی تھی ہر خوشی میں ان کے قدم تیز تر اٹھنے لگے۔

☆.....☆

دن بڑے مزے میں گزرنے لگے تھے۔ روپہلی وسنہری دھوپ میں کھلے ہوئے لان میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھانا بہت اچھا لگتا۔ بچوں کو پڑھنے کا شوق تھا۔ انہیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھی۔ ان میں آگے بڑھنے اور پڑھنے کا جذبہ بھی تھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور بچے بھی آگے تو اس کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔

ابی جان نے مریم کو بتا دیا تھانے پڑوسیوں کے متعلق اور دونوں اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ہفتہ گزر گیا وہ لوگ نہیں آئے تو مریم نے اگلے ہفتے ٹرے سجا کر ان کے گھر ناظرہ کے ہاتھ بھجوا دی۔

موسم بدل رہا تھا۔ اب شام ہوتے ہی رات میں بدلنے لگتی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ناظرہ نے گھر کے آخری کونے میں لکڑیاں ذخیرہ کرنی شروع کر دی تھی۔ ناظرہ کا مشورہ یہ بھی تھا کہ خشک خوراک، دالیں، جاول، گندم، آلو، پیاز وغیرہ جمع کرنا شروع کر دیں۔ کسی وقت، کسی دن بھی برہنہ شروع ہو سکتی ہے۔ ابی جان کا ارادہ تھا کہ ایک چکر مار کر کٹ کا لگا لیں اور ایک شہر کا کچھ رقم نکلوا لیں، ان کی پنشن بینک میں چلی جاتی تھی۔

مدحت ولا، ذالوں نے شاید باپ اور بیٹی کو بھلا دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے تذکرہ نہیں کرتے تھے مگر دل میں خیال بھی جاگتے تھے اور دھیان میں درہمی آنکھوں کو نم کر دیتے تھے۔ مگر ان لوگوں کی بے حسی کا جو نہیں ٹوٹا تھا۔

کرل افتخار کا دل بے حد پر مال تھا۔ ثوبان سے انہیں یہ توقع نہیں تھی مگر شاید اس نے بھی باپ کے نقش قدم پر قدم جمالیے تھے۔

اگلے دن جب موسم بے حد سرد ہو رہا تھا۔ عصر سے ذرا پہلے یہ لوگ محمد لغاری کی جانب نکل آئے۔ ان لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔

گھر میں تمام گلزار یہ ان کی امارت ظاہر کر رہی تھیں۔ ”دراصل مصروفیت تھی۔ آتے ہی فلو نے حملہ کر دیا۔ اب ذرا طبیعت بہتر ہے۔“ عمر تو ابھی تک بستر پر ہے۔ ٹھہریں میں ملواتا ہوں۔“ لغاری صاحب نے مریم کو سکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

مسر لغاری چائے کے لیے اپنی ملازمہ کو آواز دینے لگیں۔ اس وقت ٹکجے سے حلیہ میں ناک پر رومال رکھے، چھینکے مارتا ان کا بیٹا آ گیا۔ شاید اسے حدت بھی تھی چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”میرا بیٹا عمر لغاری۔“ محمد لغاری نے بیٹے کا تعارف کرایا۔

”آ۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ السلام علیکم!“ عمر نے چینیٹ مارتے ہوئے سلام کیا تو یکدم سب ہنس دیے۔

”موسم کا ٹیک ہے۔“ کرل صاحب بولے۔

”ایسا ویسا! ماحول سے مطابقت کے لیے یہ ایک ضروری ہوتا ہے۔“

مریم خاموش بیٹھی نگ ہاتھ میں لیے سنتی اور ادھر ادھر دھرتی دھرتی رہی۔

”آپ کیا کرتی ہیں؟“ عمر نے ڈائریکٹ اس سے سوال کیا۔

”کچھ نہیں فارغ رہتی ہوں، یہاں ہو بھی کیا سکتا ہے۔“ وہ دیر سے مسکرائی۔

”ارے میری پوتی بڑے کام کی ہے۔ میری خدمت کرتی ہے۔ اتنے ڈیر سارے مشاغل ہیں کہ۔۔۔۔۔“

”ابی جان۔“ اس نے خشکی کے تاثر سے انہیں ٹوکا تو وہ ہنس دیے۔

”آئیے گا اور ملاحظہ فرمائیے گا۔“ کرل صاحب بولے۔

”ضرور۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔“ عمر بھلے چنگے انداز میں صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھا۔ کرل صاحب کو لطیفہ سنا

رہا تھا اور وہ ذوق و شوق سے ان سے محفوظ ہوتے اور گرد سے بے خبر تھے۔

”ابی جان پانچ بج رہے ہیں۔“ مریم نے توجہ دلائی۔

”اوہو ہاں چلو بیٹا اندر میرا پھیل گیا ہو گا اور لائٹ بھی راستے میں نہیں ہے۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کل آئے گا۔“ لغاری صاحب نے چلتے چلتے آنکری۔

”فرد ضرور۔“ محمد لغاری کے بجائے عمر لغاری انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوا سر ہلارہا تھا۔

”آپ بھی ابی جان جہاں بیٹھے ہیں ادھر کے ہی ہو جاتے ہیں۔“ اس نے ناراضگی سے انہیں دیکھا۔

”کیسی باغ و بہار ایسی شخصیت ہے باپ بیٹے کی۔“ وہ اب بھی وہیں تھے۔ کسی پر اتنی جلدی، اتنا اعتبار نہیں کر لیتے ابی جان۔“ اس نے سمجھایا۔

”بیٹے جی! اس دیرانے میں اتنے عرصے بعد کچھ اپنی اپنی سی شکلیں نظر آئی ہیں۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ میں تو تمہاری اور ناظمہ کی شکل دیکھ کر بور ہو گیا تھا۔“ کرنل صاحب لکڑی کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئے اور پھر چند سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کا دروازہ اور پھر گلاس ڈور کھول کر لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا نہیں کہ مریم خفگی سے انہیں دیکھ رہی ہے اور پھر وہ خود ہی قدم بڑھا کر ان کے پیچھے بھاگی تھی۔

”لیکن میں آپ کی شکل دیکھ کر بور نہیں ہوئی، کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ میرا اول اور آخر آپ ہی ہیں۔ میں نے آپ کے سائے تلے زندگی گزاری ہے۔“ بولتے بولتے اس کا لہجہ بھرا گیا۔

”آج آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ میں آپ پر

بوجھ ہوں اور آپ آپ صرف میری وجہ سے اس جنگل بیابان میں رہ رہے ہیں۔“ وہ فلور کشن پر گری گھٹنوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رودی اور کوٹ اتار کر بیٹنگ کرتے اس پر ادنی ٹوپی لگاتے کرنل افتخار احمد نے پلٹ کر اسے دیکھا اور چونک گئے۔ کس بری طرح رورہی تھی وہ۔

”مریم..... مریم! یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹا۔ وہ تو سب مذاق تھا۔“ وہ بے چینی سے اس کے قریب آ کر بیٹھے اور اس کا سر اٹھایا۔

”مجھے آپ ہاسٹل میں داخل کرادیں اور آپ واپس چلے جائیں۔ یہ موسم، یہ تنہائی آپ کے لیے بہتر نہیں ہے۔ آپ..... آپ.....“ اس نے ناراضی سے ان کا ہاتھ جھٹکا۔

”بری بات بیٹا ایسے نہیں کرتے تم..... تم جانتی ہونا کہ.....“ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مریم ان کی بات کا اتنا اثر لے گی۔ انہوں نے پیار سے اسے منایا۔

”میں اپنے بیٹے کے ساتھ بور ہو سکتا ہوں بھلا۔ یہ چکن، یہ کیوٹر، یہ خرگوش وہ دو چھوٹی چھوٹی بلیاں، کتنا مکمل گھر ہے۔ تنہائی کیسی۔“ انہوں نے اسے پیار سے چمکایا۔

اور وہ خفگی سے انہیں دیکھتی ہوئی ہنس دی، انہوں نے پھر سے شرارت کی۔

”مگر ایک مسئلہ ہے کہ یہ شہر خنچ نہیں کھیل سکتے۔“

”ابی جان۔“ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کرنل صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

اسی دوران ناظمہ انہیں کھانا لگنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ دادا پوتی کی بھرپور محبت اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ بلکہ کوئی بھی محبت پہلی بار دیکھی تھی۔ محبت نے کبھی اسے نہیں چھو ا تھا اور شاید جہاں افلاس

ہو مفلوک الحالی ہو وہاں محبت قیام نہیں کرتی۔

☆.....☆

اس بار صبح سے شام تک کے لیے کرنل افتخار احمد اکیلے ہی شہر گئے تھے۔ واپسی پر ڈیڑھ سا سامان، کتابیں اور مریم کا فراموشی پر گرام تھا۔ مریم شوق و دلچسپی سے صبح کی روچھلی سنہری دھوپ میں لان میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتی تھی۔ شفیق کہیں سے ایک سفید رنگ کا کتا لے آیا تھا۔ چوکیداری کے لیے وہ بہت ٹھیک تھا۔ آج کل ابی جان اسے خود سے مانوس کر رہے تھے۔

اس روز جب سنہری دھوپ میں وہ بچوں کو خدا ایک، رسول ایک ہے، ہمیں اس کی پیروی کرنا چاہیے پڑھا رہی تھی کہ پھاٹک کا دروازہ کھلا اور عمر اپنی والدہ کے ساتھ اندر آ گیا۔ مریم نے بڑے سکون سے گھاس سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

”تم نے تو اچھا خاصا اسکول کھولا ہوا ہے ادھر۔“ مسز لغاری کے کہنے پر مریم ہنس دیں۔

”ایسی تنہائی میں یہ مشغلہ برا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے عمر نے ایک طائرانہ نگاہ بچوں پر ڈالی اور مریم پر روک دی تھی۔

”ابی جان اندر ہیں۔ ناظمہ انہیں اندر لے جاؤ۔“ اس نے مٹر چھتی ناظمہ سے کہا تو وہ اندر بڑھ گئی۔

”اوہو یہ تو یہاں چھوٹا سا Zoo بھی ہے۔“ چوزوں کا بچھر، کیوٹر کا بچھر، کوئے میں کھیلنے خرگوش، دھوپ سینکتی بلیاں اور بال سے کھیلنا ڈوگی۔ عمر شوق اور دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”یہ سب آپ کے شوق ہیں۔“ عمر، مریم کے قریب رکا۔

”جی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی مسکرائی۔

”ویلدن..... ویلدن۔“ وہ اسے سراہتے

ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ٹوبان کی شہادت دیتا عمر لغاری جانے کیوں اسے عجیب سا لگا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عقاب سی۔ کچھ عرب زبان بھی لگا۔ چالپوس ٹاپ کا۔ مسلسل بے لاگ بے معنی بول سکتا تھا۔

عمر کو دیکھ کر اسے ٹوبان یاد آ گیا تھا۔ اسی لیے وہ ابی جان کے سامنے ناراضی کا اظہار کرتی روئی تھی۔

☆.....☆

بہت عرصے بعد ٹوبان کی کال آئی تھی مگر اس نے ریسو نہیں کی۔ ٹوبان نے اسے محبت دی تھی۔ محبت کا اعتماد نہیں دیا تھا۔ محبت میں اعتماد نہ ہو تو محبت بے اعتبار ہوتی ہے اور ٹوبان کی محبت بے اعتبار تھی۔ وہ اس کے لیے اسٹینڈ نہیں لے سکتا تھا۔ گھر والوں سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ محبت کو امان نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اپنے آدرش عزیز تھے۔ اس کی خواہشوں کی فہرست میں اس کا نمبر سب سے آخری تھا اور آخری خواہش پوری نہ بھی ہو تو گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔

اس کے موبائل پر اس کا ایس ایم ایس بھی آیا تھا اور آئی مس یو کا شیخ پڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

امیدوں کی سبج دل میں مت جلا نا اس جہاں سے الگ دنیا مت بسا نا آج موڈ میں ہو تو ایس ایم ایس کر رہے ہو روز روز انتظار میں پلکیں مت بچھنا

اس نے آج صبح مستقل طور پر اپنا سیل آف کر دیا تھا۔ کیا فائدہ ایسی آکاس نکل اسی محبت کا۔ وہ بہت حقیقت پسند لڑکی تھی۔ کاندھی خواب اور کاندھی خوشبو اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

”باجی میں نے کام کر لیا ہے۔“ زیتون اس کے پاس آ گئی۔ اس نے سر جھٹک کر اسے دیکھا اور دیر سے سے کاپی تمام لی۔ یہ مصروفیت دھیان بنانے کے لیے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے ہر فہاری

کے بعد جو برف پچھلے گی تو سب کچھ گندہ محبتوں کا دفن ہو جائے گا۔ یقیناً محبت، اعتماد، یقین اور شری بندھن میں مجھے ملے گی۔“ یہ سب سوچتی وہ دھیرے دھیرے بچوں کا کام چیک کرنے لگی اور پھر وہ مسکراتے ہوئے انہیں ہوم ورک دینے میں مصروف ہو گئی۔

☆.....☆

”کیا بات ہے ناظمہ! تمہاری برہنہاری ابھی شروع نہیں ہوئی۔“ اس نے ڈرائی فرسٹ سے منتقل کرتے ہوئے ناظمہ کو دیکھا۔

”لوگ تو دعا کرتے ہیں کہ برہنہاری نہ ہو۔ تاکہ نئے مسئلوں سے بچے رہیں۔“

”ہلکی پھلکی تو ہو ہی جائے نا، میں پہلی بار دیکھوں گی۔“ اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ ابی جان ٹیلی ویژن پر ٹاک شو دیکھ رہے تھے اور وہ ناظمہ سے باتیں کر رہی تھی۔ تب ہی باہر پھاٹک زور سے بجا۔ سب چونک گئے۔ ان کے کان پر پہلی دستک تھی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ ابی جان نے کہا تھا مگر اتنی دیر میں ناظمہ کچن کی کڑکی سے دیکھ بھی آئی۔

”ابی جان وہ برابر کے گھر سے آدی ہے۔“ ناظمہ نے اطلاع دی۔

”اچھا! لغاری صاحب ہوں گے۔“ کرمل صاحب سرعت سے اٹھے۔ باہر وہی تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہی تو بن گئے تھے۔ دونوں ہی شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے۔

پہلی شام رات کے دروازے پر دستک دیجی گرم ہونے لگی۔ دونوں کے قبضوں نے بھی فضا کو گرم کر دیا تھا۔

اگلے دن داک کے لیے نکلی تو ”مس پلیز“ کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو عمر لغاری بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے وجود میں

ناگواری سی پھیل گئی۔ جانے کیوں اسے یہ شخص اچھا نہیں لگا حالانکہ اس کے بھی کزنز تھے۔ طاہر، آیان، ثوبان اور سب پڑھے لکھے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے تھے۔ ان میں شائستگی کا عنصر نمایاں تھا۔ مگر یہ شخص.....

”آپ سے دوستی ہو سکتی ہے۔ لگ رہا ہے آپ داک کرنے جا رہی ہیں۔ میں ساتھ دوں۔“ وہ بے تکلفی سے کہتا اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

”دراصل میں اتنی مصروف رہتی ہوں کہ مجھے کسی کی دوستی کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں داک کرنے نہیں جا رہی۔ کچھ سوچی ہوئی لکڑیاں لینے جا رہی ہوں۔“

”ساتھ چلتے ہیں۔“ وہ یہ سن کر بھی ساتھ چلنے پر بضد تھا۔

”لگتا ہے آپ نے یہاں کا سارا علاقہ دیکھ لیا ہے۔“ یہ کہتے اس نے قدم آگے بڑھائے۔

”نہیں ابھی تو دیکھ رہا ہوں۔ دراصل کوئی کمپنی نہیں ہے تو اکیلا بور ہو جاتا ہوں۔ آپ کی کمپنی جوائن کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں مگر آپ.....“ اس نے اس کے محتاط رویے کی جانب اشارہ کیا۔

”یہاں تنہائی اور اکیلے پن میں آپ نے کافی دلچسپی کے سامان کر رکھے ہیں ورنہ اس عمر کی لڑکیاں تو.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور آگے کا جملہ اسے سمجھ آ گیا۔

”لڑکیوں، لڑکیوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔“ مریم نے برجستہ جواب دیا۔

”آپ کے دادا بہت زندہ دل آدمی ہیں۔“ جی میری پوری فیملی ہی بہت زندہ دل اور شرارتی ہے۔“

”ویسے آپ اس دیرانے میں ایک بوڑھے

انسان کے ساتھ کیسے رہ رہی ہیں؟“ عمر کے منہ سے اچانک نکلا تھا۔

اس کی بات سن کر مریم کے قدم رک گئے۔

”وہ بوڑھے انسان میرے دادا ہیں۔ ان کی خدمت مجھ پر فرض ہے۔ انہوں نے مجھے پالا ہے میرے بچپن کی ڈیٹھ کے بعد۔“ اسے، اس کی بات نے دکھ دیا تھا۔

”اوہو۔“ عمر نے اسے تاسف سے دیکھا۔ ”لگتا ہے آپ کو برا لگ گیا ہے؟“ وہ دھیرے سے ہنسا۔

مریم قریب کی سوچی جھاڑیوں سے ٹھنڈیاں توڑنے لگی۔ ”میں اپنے ابا کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی۔“ وہ سلگ کر بولی۔

”سوری۔“ وہ سر جھکا کر مسکرایا۔ ”آپ خاصی مختلف لڑکی ہیں۔“

”ہاں مختلف مزاج۔“ اس نے عمر کو ہنسنے چتونوں سے دیکھا اور مطلوبہ ٹھنڈیاں اکٹھی کر کے واپس چلنے لگی۔

”دراصل ہم قبائلی لوگ نا، ذرا اور طرح کے ہوتے ہیں اور ہماری عورتیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔“ مریم قدم روک کر اور سر گھما کر اسے دیکھنے لگی جس کی گردن پر کلف لگ گیا تھا اپنے قبیلے کے فخر کا۔

”لیکن جس ماحول سے آپ آئے ہیں، جس ماحول میں آپ نے تعلیم حاصل کی ہے اس لحاظ سے تو آپ کو اس نظام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ اس نے جیسے سے ترغیب دلائی تھی۔

”نہیں۔“ عمر نے سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے دیکھا اور گویا ہوا۔ ”ہمارے قبیلے کے رسم و رواج اور اقدار جوں کے توں ہیں۔ اسے ہمارے آباؤ اجداد نے بدلا ہے اور نہ ہمارے آج کے سرداروں نے

اس نظام کو بدلتا ہے۔“

مریم کے وجود میں غصے کی ایک لہر سرائیت

کر گئی۔ سرداری قبائلی نظام اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ قدرت اگر اسے موع دیتی تو ضرور ان کے خلاف کام کرتی مگر بھلا ہو ثوبان کا جس نے ہمیشہ اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ کتنا فخر تھا اس کے لہجے میں، ہونہ..... اس لیے یہ شخص مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو نظام کو نہیں بدل سکے“ شعور کو نہ جگا سکے، تبدیلی نہ لاسکے، ایسا تو ایسے ہی جیسے.....“ وہ بوڑھے بولتے بولتے اچانک رک سی گئی۔

”ارے ارے اتنی جذباتیت ٹھیک نہیں۔“ عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کے خاندان کی عورتیں آج بھی ان پڑھ اور جاہل ہیں۔“ وہ کہاں چپ رہتی تھی۔

”ہاں مگر..... بے حد سمجھدار۔“ عمر نے پھر سے اکر کر جواب دیا اور وہ سلگ اٹھی۔

”ہاں یہ سمجھداری ہے کہ اپنے عقل و شعور کو استعمال نہ کریں اپنی آزادی رائے کو رہن رکھو ادیں۔ اپنے حقوق کا استعمال نہ کریں۔“ وہ طنز یہ بولی۔

”وہ اتنا پڑھ کر کیا کریں گی؟ ان کے لیے قرآن کی تعلیم بہتر رہتی ہے۔“ عمر لغاری کے لہجے میں کوکتے اعتماد سے مریم کو گھمن سی آنے لگی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کلچ کی جانب چلنے لگی۔

”ارے ارے سیں تو.....“ عمر لغاری پیچھے بھاگا۔

”کیا فائدہ تھا ایسے بے حس غاصب لیروں سے ملنے کا جو خود غرضی کی انتہا کر دیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

”کیا ہم یہاں مل کر کل میر کے لیے جاسکتے ہیں؟“ اس کی بات سن کر وہ کانچ کے آگے رکی اور گھوم کر غصے سے بولی۔

”نو..... نیور..... میں ابی جان کو لکھ بھر کے لیے

تہا نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی طبیعت..... اس کی آنکھوں میں شوق اور دلچسپی دیکھ کر وہ چپ سی ہو گئی۔ اس کی کینہ تو زنگاہوں نے اسے کراہیت میں جٹا کر دیا تھا۔

”اٹھلے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ عمر نے اندر آنے کا ہانہ گھڑا۔

”نہیں سردی بہت ہے اس وقت وہ بستر میں ہوتے ہیں۔“ اس نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”ٹھیک ہے کل صبح ملاقات کر لوں گا۔“ وہ اسے پر شوق نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

مریم بھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئی اور پلٹ کر بھاٹک بند کر کے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہ کی بے باکی نے اس کے اندر آگ بھڑکا دی۔ وہ وڈیرہ تھا، مستقبل کا سردار تھا، نسل در نسل چلنے والا جاگیردار۔ اس سے کچھ بھی کہنا عیب تھا اور وہ لفظوں سے نہیں روپیے سے بتا دیتا چاہتی تھی کہ وہ اس کے لیے کوئی مافی نہیں رکھتا۔

وہ پٹلی اور مضبوط قد تھوں سے آگے آگے چلتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی گھاس ڈور کھولا اور پروتار انداز سے اندر داخل ہو گئی۔ عمر لغاری حدنگاہ تک اسے دیکھتا رہا۔

یہ وقار یہ اعزاز یہ معصومیت ہی تو اس کا آئیڈیل تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر بھاٹک سے ٹیک لگا کر مسکرایا اور سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔

”تم میری ہو۔“ وہ آنکھیں بند کر کے مسکرایا اور میں عمر لغاری ہوں، جس کے ہاتھ میں دنیا ہے اور دنیا کی ہر چیز اس کی ہے۔ اس کی ٹانگی میں بند۔ وہ بڑے یقین سے مسکرایا اور اعتماد سے آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆

وہ اکثر اب اس کے راستے میں آنے لگا، کبھی والد کے ساتھ تو کبھی والدہ کے ساتھ، مگر کبھی آنے

لگا۔ مریم اس سے گریزاں ہی رہتی تھی۔ ادھر ادھر ہو جاتی۔ ناظمہ کے ساتھ کچن میں مصروف ہو جاتی اور اگر بچوں کو پڑھا رہی ہوتی تو ان کے جانے تک پڑھاتی ہی رہتی۔

اس کے گرد پرندوں اور بچوں کی محسوس دنیا تھی جو بے ریا محبت کرتے تھے بے لوث چاہتیں دیتے تھے۔

”عمر لغاری تمہیں کیا لگتا ہے؟“ اس روز لڈو کھیلنے ہوئے ابی جان نے مریم سے اچانک پوچھا۔

”اپنی باری چلیں ابی جان! لٹے سیدھے سوال مت پوچھیں۔ دیکھیں آپ کی کوٹ پٹ رہی ہے۔“ وہ مکمل کھیل کی طرف متوجہ تھی۔

”مجھے تو خاندانی اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے ہیں۔ خاصی جائیداد ہے ان کی۔ لغاری تیار ہا تھا۔“ کرٹل صاحب کا سوال ہنوز سوال تھا۔

”ابی جان ہمیں کسی کی جائیداد سے کیا لینا اور یہ سب چیزیں انسان کو کیا دیتی ہیں؟ خود آپ کے پاس کتنی جائیداد ہے؟“ اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”میرے خیال میں تم عمر لغاری کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو۔ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

مریم سر اٹھا کر نہیں دیکھنے لگی۔ وہ سر جھکا کر باری لے رہے تھے۔ ”لو جی“ کھیل ہی ختم ہو گیا۔

”جانے ہیں آپ یہ جاگیر دار قسم کے لوگ کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ ایسا سوچے گا بھی مت۔ جہاں مجھے خوش رہنا ہے میں رہ لوں گی۔ آپ تو میری بالکل پروا مت کریں۔“ مریم کو غصہ آ گیا تھا ان کی بات پر۔

ابی جان سے اس سوچ کی توقع نہیں تھی مگر رات اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے رمان سے سوچا کہ شاید

وہ حق بجانب ہیں۔ وہ پچیس سال کی ہو رہی تھی اور مادی تو دور کی بات اس کی مگنی بھی کہیں نہیں ہوئی تھی۔ ابی جان ہی اس کے خیر خواہ تھے اس کے لیے تلاش کرنے کہاں تک جا سکتے تھے؟

مگر..... دیر سے وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ زندگی گزارا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ یہاں ان مقامی لوگوں کے گھر کے لیے نیک مقصد کے لیے اس زلیست کو استعمال کر دیا جائے۔

بے شک ہم لوگ انہوں سے واپس ہو چکے ہیں مگر میں کنویں میں چھلانگ نہیں لگا سکتی۔

☆.....☆

صبح وہ چپ چپ سی تھی خاموشی سے ناشتا ہوانہ لی ویٹن آن تھا اور نہ ریڈیو کا مدہم مدہم شور تھا۔ صبح کے طور پر مریم جلد ہی لان میں نکل آئی۔ اسے ہی لمحے اس پر انکشاف ہوا۔ رات بجلی پھٹکی لہاری بھی ہوئی تھی۔ موسم بے حد امیر آلود تھا۔ گھاس میں ٹھنڈک کا احساس نمایاں تھا۔ درختوں کے پتے پتے نئے سفید ذرات ٹھہرے ہوئے تھے اور ایسا محسوس اس کی کمزوری تھا۔ وہ دیر سے دیر سے لان میں کھلتے ہوئے قدرت کی صنای پر غور کرنے لگی۔

کرٹل اختیار احمد سگار سلگائے کتاب گود میں لے گا اس وال سے اسے دیکھتے عین سوچ میں گم یوں لگ رہا تھا جیسے آج بھی اسے ٹوپان کا طوفان تھا۔ خطرے سے ان لوگوں کی جنہوں نے اسے ادا کیا تھا اور آج بھی اسے ان کی آہٹ کا انتظار نہیں..... میں کیا کروں اس کے لیے؟ لغاری ابھی ہے مگر اس کی ناپسندیدگی.....

”صاحب جی موسم کی پہلی برف باری کا آغاز ہے۔“ ناظمہ نے انہیں کافی کامگ پکڑا لیا اور ان میں آگ ٹھیک کرنے لگی۔

”ہوں..... مریم کو بھی دو۔ کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے باہر۔ اسے کپڑا اندر آجائے۔ یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کتاب کھولی۔

”ہوم ڈاکٹر تو ہے نا۔“ مریم اندر آ کر سن چکی تھی دیر سے سے پیچھے سے ان کے شانوں پر جھک گئی۔ وہ چونکے۔ اپنائیت کی مہک ان کے گرد پھیل گئی۔ دونوں نے ہی اپنی اپنی سوچوں کو جھٹک کر ایک دوسرے کا دھیان کیا۔

”مجھے شطرنج سکھائے تاکہ آپ کو ادھر ادھر نہ دیکھنا پڑے۔“ کرٹل اختیار احمد نے چونک کر اسے دیکھا اور ہنس پڑے۔

”اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ مریم نے خفگی کے تاثر سے انہیں دیکھا اور ان کی آنکھوں میں چھپی ہنسی کو دیکھ کر ہنس دی۔ وہ اس کا عندیہ جان گئے تھے۔ اپنی کوئی خواہش منوانے کے لیے وہ یوں ہی بات کرتی تھی۔

”کچھ نہیں کرنا پڑنے گا کیونکہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں سردی بہت لگتی ہے آپ کو۔ ٹھنڈ لگ جانے کا خطرہ ہے۔ مجھے آپ ادھر سے ہی وہاں سامنے اس دیوار کے پار برف میں کھیلنے دیکھیے گا۔ میں برف کے بھالو بناؤں گی۔“

وہ کھٹکھٹا کر ہنس دیے اس کی اس معصوم سی خواہش پر۔ ”یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا لڑکی! فوجی آدی ہوں اور فوجی کا دل جذبہ اور امنگ ہمیشہ جوان رہتی ہے۔“ کرٹل صاحب نے سیدھے ٹھونکا۔

”مگر بوڑھے فوجی کی نہیں اس نے شطرنج کی بسات بچھاتے ہوئے انہیں چیخا تو وہ کھٹکھٹا کر ہنس دیے۔ ماحول کا تناؤ غائب ہو گیا تھا۔ ناظمہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی اور اسی پل واپس آئی تھی۔ باہر بھاٹک زور سے بج رہا تھا اور وہ کچن کی کھڑکی

سے دیکھ چکی تھی۔

”لغاری صاحب آئے ہیں۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”لے آؤ انہیں ادھر ہی ان کی بیگم اور بیٹا بھی ساتھ ہیں۔“ ناظمہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

”بہت فارغ رہتے ہیں یہ لوگ۔ کوئی کام ہی نہیں ہے۔“ ناگاری سے کہتے وہ ہاں سے اٹھ گئی۔

داخلی دروازے سے وہ لوگ اندر آ گئے اور لاؤنج آباد ہو گیا۔

جموئے نکار منافق لوگ۔ خود پیش کرتے ہیں اور گھر کی عورتوں کو قید کر کے باندیاں بنا لیتے ہیں۔ ادھر ہی یہ انکشاف ہوا بلکہ خود لغاری صاحب

نے کیا کہ بیگم ان کی دوسری بیوی ہے اور عمران کی پہلی بیوی سے ہے۔ یہ لوگ شہر میں رہتے ہیں۔“

مریم کا مطلق تک کر دیا ہو گیا اور گاؤں میں ان کی قیدی باندیاں غلام زادیاں ان کی توجہ کی سختی رہتی ہیں۔“

”لگتا ہے آپ کو یہ موسم بے حد پسند ہے۔“

وال مرر سے مسلسل باہر دیکھتے ہوئے عمر لغاری نے قریب آ کر اس سے پوچھا۔

”جی۔“ وہ مختصر آہولی۔

”آئیے باہر چلیں پھر۔“ اس کی آنکھیں اندرونی احساس سے چمک رہی تھیں۔

”میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”تو آپ موڈی ہیں؟“ وہ اس کے سامنے فلور کشن پر بیٹھ گیا۔

”بہت زیادہ۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”مگر لڑکیوں کے لیے یہ اچھی بات تو نہیں۔“ اس نے صلاح دی۔

”کیوں؟ کیوں اچھی بات نہیں؟ مرد کچھ بھی کریں اور لڑکیاں اپنا موڈ بھی کر سکتیں؟“ وہ

بھڑک اٹھی تھی۔

”نہیں میرا مطلب ہے کہ لڑکیوں نے اسے گھر جانا ہوتا ہے نا۔“

اس کے یہ کہنے پر مریم اسے گھور کر رہ گئی۔

بھئی شادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں زنجیر پہن لوں۔ اپنی سوچ اپنا ذہن اپنا دل جذبات رہا رکھ دوں۔“ اس نے سکتے ہوئے لہجے میں منجیہ سے کہا۔

”اور شادی بھی میری سوچ سمجھ کر کروں گی۔“ عمر لغاری جانے کس بات پر سر جھکا کر نفس اور کرٹل افکار احمد پوتی کے تاثرات اچھی طرح پڑھ سکتے تھے۔

”مریم! اچھی سی کافی بنا کر لاؤ۔ ناظمہ۔“ مت بنو نا۔“

ان کے جانے کے بعد آج ابی جان کچھ خاموش اور چپ سے تھے۔ کہیں کہیں خدشے دل کی زمین سر اجمار کر انہیں ہولانے لگتے تھے۔

نہیں ایسا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ابی جان اس ذہنی سوچ اور خیالات سے واقف ہیں دل کو یقین تھا مگر صبح ایک انکشاف اس پر ہوا کہ لغاری

اسے پردہ پوش کر کے گئی ہے۔ مریم ان کے بیٹے کو بھانگ گئی۔ آگے کا سفر وہ اس کے ساتھ طے کرنا چاہتا اور یہ سب ابی جان نے خاموشی سے سن لیا تھا۔

اس کا عزم اس کا خردم توڑ گیا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ ابی جان کی توجہ کہیں اور تھی۔ وہ جانتے تھے اس کی پسند کیا ہے اور کیا وہ اس کے مستقبل سے

ماپوس ہو گئے تھے؟ دیر سے ان کے آگے اٹھ کر وہ لاؤنج سے ہوتی گلاس مرر کھول کر باہر

گئی۔ اس کا اندر رنج سے بھر گیا۔ باہر ا خوبصورت منظر تھا۔ موسم کی برہاری میں اضافہ

تھا۔ سبزی مائل عالیچے پر اب سفید روئی کا کارپجھ چکا تھا۔ فضا میں بے حد شندھی۔ وہ دیر سے

سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

☆.....☆

اگلے دو دن غیر معمولی خاموشی کی نذر ہو گئے۔

ابی جان جانتے ہیں کہ مجھے قبائل، قبیلے سردار

گھیردار اور جاگیردارانہ نظام کتنا برا لگتا ہے پھر

..... پھر بھی وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ عمر لغاری

پر پوزل آیا ہے؟ اس کے بیخ بستہ رخساروں پر

سو بہہ نکلے۔ کیا میں اتنی بوجھ بن گئی ہوں کندھوں

مجھے اتار بھیٹنا چاہتے ہیں؟

’ہاں۔‘ دوسرے لمحے اس پر انکشاف ہوا۔ ’ہاں‘

میرے وجود سے اکتا گئے ہیں اس تنہائی سے اکتا

ہیں اس موسم اس سردی اس برہاری سے تھک

ہیں۔ وہ یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزار

ہے۔ اب اس عمر میں وہ اپنے پیاروں کے درمیان

بٹا چاہتے ہیں اور میرے بوجھ کو اتار کر اپنوں میں

بٹا جانا چاہتے ہیں، اس کے آنسوؤں نے

سایوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

’تنہائی! محرومی! اکیلا پن اور قیسی کتنا بڑا دکھ

..... میں مجھے موت کیوں

لگتی آ جاتی؟‘ اس نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور پھر

سے ہی لمحے اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک فیصلہ کر

لی تھی۔

موسم کی برہاری اگرچہ شروع ہو چکی تھی مگر

اسی راستے ابھی بند نہیں ہوئے تھے۔ اسے کسی

دل میں چلے جانا چاہیے۔ پڑھے گی، چاب کرے

گی اور اپنے اخراجات خود برداشت کرے گی۔

کی گزر جائے گی مگر کسی جاگیردار کی ملکیت نہیں

گی۔ جس نظام سے اسے نفرت ہے اس نظام کا

نہیں بنے گی۔ یہ سب سوچ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

ایسا ہے تو ایسا ہی سہی اگر ابی جان اسے کچھ کہہ

اسکتے ہمارے مردوت کے تو وہ تو سمجھ سکتی ہے نا۔

مردہ کلج کے اندر پلٹ آئی۔

☆.....☆

اگلے دو دن غیر معمولی خاموشی کی نذر ہو گئے۔

صرف دو بچے پڑھنے آئے تھے۔ برہاری نے راستے

بند کر دیے تھے۔ اگلے دو دن وہ بھی نہیں آئے۔

برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ باہر

برف کی سفید براق چادریں چھٹی ہوئیں۔ ارد گرد

کے منظروں کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گلاس

وال سے باہر کتنی دیر تک دیکھتی وہ مستقبل کے بارے

میں سوچتی، منظروں کی خوبصورتی دل پر محسوس کرتی

تھی اور ادھر کرٹل افکار احمد الگ اپنی سوچوں میں گم

رہتے تھے۔

سوچتے سوچتے اکثر مریم کی آنکھیں بھی نم ہو

جاتیں۔ ’کیا تھا ابی جان کہہ دیجئے یہ انگج ہے، مٹکی

ہو چکی ہے مگر..... مگر.....‘

اس روز گھر کے لاؤنج میں لغاری صاحب اپنی

بیگم کے ساتھ براجمان تھے۔ مریم جل کر رہ گئی۔

’یہ کیا جانیں حقوق اور فرائض کی جنگ یہ کیا

جانیں دکھ کا احساس۔ اس عورت کا دکھ یہ کیسے محسوس

کر سکتے ہیں جو گاؤں میں بیٹھان کر بچوں کو پال رہی

ہے اور یہ دوسری بیوی کے ساتھ یہاں رنگ رلیاں

منار رہے ہیں۔ اس منافقت سے اسے گمن آنے

لگی۔ اگر ابی جان نے فیصلہ ان کے حق میں دیا تو وہ

احتجاج کرے گی۔ اپنے حق کے لیے لڑے گی

اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ دے گی۔ اس نے اپنے دل

میں محکم فیصلہ کر لیا اور باہر نکل گئی۔

وہ کتنی دیر تک برف پر چلتی رہی، ادھر ادھر گھومتی

رہی، واپسی کے رستے میں عمر لغاری سے ٹکراؤ

ہو گیا۔ وہ بھی گلے میں دوڑ بین لٹکاے گھوم رہا تھا۔

”میرے اور آپ کے شوق کتنے ملتے جلتے

ہیں۔“ وہ انتہائی شوق سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں۔“ اس نے بنیدگی سے رخ پھیر لیا۔

”کم سے کم اتنا تو ہے قدرت کی صنای آپ کو

بھی پسند ہے اور مجھے بھی۔“ وہ مسکرایا۔

”خوبصورت موسم سب کو پسند ہوتے ہیں۔“ وہ کہاں کپڑا کرنا جانتی تھی۔

”یہ تو ہے ویسے آپ کو معلوم ہے امی ابو کیوں آئے ہیں؟“ دبی دبی مسکراہٹ لیے سینے پر ہاتھ باندھے سر پر ادنیٰ ٹوپی لیدر کی جیکٹ پہنے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”جی نہیں۔“ اس کی رکھائی ہنوز برقرار تھی۔
”لگتا ہے آپ کے ابی جان کو آپ پر اعتماد ہے۔“ مسکراتے ہوئے جملہ ادا ہوا تھا۔

”ہاں وہ جانتے ہیں کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”اچھا آپ کی رائے میرے بارے میں کیا ہے؟“ عمر چھوٹے ہی اصل بات پر آیا تھا۔

”میں چلوں سردی بہت ہو رہی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیے جسے وہ اس کی شرم سمجھا تھا۔

”مجھے مشرق کی یہی ادا تو ابھی لگتی ہے۔“ وہ اسے جانا دیکھ کر ہنسا اور گنگنا۔ ”کچھ بھی نہ کہا اور

کہہ بھی گئے“ مریم نے ایک بار پھر سر گھما کر غصے سے اسے دیکھا اور وہ اس کی چپ کو خاموشی سے تعبیر کر رہا تھا۔

”میں ایسے لوگوں کے بارے میں کوئی رائے نہیں رکھتی جو منافق ہوں۔ جن کا ظاہر اور باطن الگ

الگ ہو، جنہیں انسانی حقوق اور انسانیت کے بارے میں کوئی علم نہ ہو۔ جو زندگی کے راستے میں

آنکھیں بند کر کے چلیں اور جو صرف اپنی خوشیوں کے لیے جیتے ہوں۔“

یہ سب سن کر عمر لغاری کی ہنسی کو بڑیک لگ گیا اور وہ چٹکی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟“
”مطلب ان عورتوں سے پوچھیے گا جو آپ کے

گھر میں عزت اور جائیداد کے نام پر بیٹھی ہیں۔ اس

عورت سے پوچھیے گا جو آپ کے نام پر آپ کی حویلی میں محو انتظار ہے کہ کب اس کا شوہر آئے اور

اس پر تڑی ہوئی نگاہ ڈالے۔“ مریم نے ایک اور اندھیرے میں چلایا۔ عمر لغاری چونک گیا۔ گویا

نشانے پر لگا تھا۔
”اور میں ادنیٰ دن ہوں اسی لیے ہمیشہ نمبروں

ہی رہنا چاہتی ہوں۔“ کو یہ ساری باتیں درپردہ ہو رہی تھیں مگر مریم نے اپنا نقطہ نظر بہت اچھی طرح

اس پر واضح کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ رکی نہیں اور سناٹے میں کھڑا سے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ سب کچھ

رہا تھا مگر نہ سمجھنے کی پوزیشن میں تھا۔
”اتنی ذہین اور مجھدار لڑکی! تمہیں میں نے

قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ خود سے وعدہ کرتے اور اپنے گم ہوتے وجود کو دیکھا تھا۔

☆.....☆

اس نے ابی جان سے کچھ نہیں پوچھا۔ جس بات

ہوتی تو اپنی رائے بتا دیتی تھی۔ وہ عقل و شہ

رکھتی تھی شاید اسے احساس ہوا کہ ابی جان کچھ خفا ہیں۔ ٹیلی ویژن کی آواز بلند تھی۔ انہوں نے ناظر

سے گرم گرم حلوہ بنوایا تھا اور اب اسے آوازیں دے رہے تھے۔

”ہونہہ، شگن کی مٹھائی، مٹھائی نہ سہی حلوہ سہی۔“ وہ دل میں سوچتی، ان کے پاس آ گئی۔

”کھاؤ کھاؤ“ بچے آؤ آج میں بہت خفا ہوں۔ دیکھو ناظمہ نے کتنا مزے کا حلوہ بنایا ہے۔

خوشی چہرے سے خوب نمایاں تھی۔
”ابی جان مجھے میٹھا پسند نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ

کے سامنے بیٹھ گئی۔
”میری خاطر کھاؤ۔“ اور وہ انہیں دیکھ کر

گئی۔ اسے رونا آ گیا، گویا لغاری فیملی کو ہاں کر رہی گئی ہے۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔“ ابی جان پھر چپکے۔
 ”اور میری خوشی؟“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔
 فیصلے کا وقت آن پہنچا کیا؟ اس نے خود سے
 وال کیا اور کمرے میں آکر بستر پر گری اور پھوٹ
 پوٹ کر رو دی۔

”ابی جان! ابی جان! میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا
 ہا ہتی مگر..... مگر میں کیا کروں! میں آپ کے اس
 فیصلے کو قبول نہیں کر سکتی۔ جس نظام سے میں نفرت
 کرتی ہوں اس نظام کا حصہ نہیں بن سکتی۔“ اس نے
 سوچ کر کشن میں منہ چھپالیا۔

ٹیلی ویژن پر موسیقی کا کوئی پروگرام چل رہا تھا،
 آواز بلند کر دی گئی تھی اور جلوہ مڑے لے لے کر کھایا
 ہانے لگا تھا شاید۔ اس کے آنسوؤں کی رفتار میں
 اضافہ ہو گیا۔

ساری رات وہ سوچتی رہی آئندہ کے لائحہ عمل
 کے بارے میں۔ ظاہر ہے ابی جان اس سے بات
 کرتے تو اس نے فوراً انکار کر کے انہیں دکھ دینا تھا اور
 غصے میں انہوں نے اسے گھر سے نکال دینا تھا۔
 ہاں سے نکلنے سے پہلے اسے کچھ معلومات کرنی
 ہیں، قریب ترین ہو ہاسٹل کے بارے میں۔ اس
 کے بعد کسی جاب کے لیے اپلائی کرنی۔ اس سے
 پہلے اسے برف باری کے رکنے کا انتظار کرنا تھا تاکہ
 راستے صاف ہوتے اور راستہ بننا۔

زادراہ کے لیے اس کے پاس کچھ چھوٹی موٹی
 پہاری تھی جس کو وہ ہر وقت پہنے رہتی۔ اگر فوری
 رہائش کا بندوبست نہ ہوا تو کچھ دن کے لیے ناظمہ
 سے پناہ مانگے گی۔

بستر پر بیٹھی، گھٹنوں پر سر رکھے وہ ان ہی سوچوں
 میں گم تھی، نیند غائب تھی، دکھ بے حد اذیت ناک
 تھا۔ اس نے اٹھ کر دھیرے سے درپچوں کے
 پائے کھینچ دیے۔

اف..... باہر برف باری بہت تیزی سے
 ہو رہی تھی۔ روٹی کے گالے ہارش کی طرح گر رہے
 تھے۔ سارا سبزہ چھپ گیا تھا۔ لان میں بلب کی زرد
 روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں آنکھوں میں ہی
 صبح ہو گئی۔ ٹائم دیکھ کر اس نے فجر کی نماز ادا کی
 قرآن پڑھا۔

دن نکلنے لگا تھا۔ وہ دھیرے سے داخلی دروازہ
 کھول کر باہر نکل آئی۔ دھیرے دھیرے تسبیح پڑھتی
 وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی اور قدرت کی صنائی پر رشک
 کرتی رہی۔

صبح ناشتے کے دوران ناظمہ نے بتایا۔ ”برف
 باری بہت ہوئی ہے راستے بند ہو گئے ہیں۔ میں نے
 شفیق سے کہا تھا کہ جب برف باری زیادہ ہو تو آکر
 راستہ صاف کر جائے۔ آج آئیں گے وہ لوگ۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ مریم خاموشی سے
 ناشتا کرتی رہی پھر اٹھ کر اپنے چوڑوں اور کپڑوں کو
 دیکھنے لگی۔ خرکوش کو شفیق اور سلیم اپنے ساتھ ہی لے
 گئے تھے۔ یہاں ٹھنڈ بہت تھی اور ان کے لیے جگہ بھی
 چاہیے تھی۔

کرنل صاحب اس پر گہری نگاہ ڈال کر اخبار کی
 جانب متوجہ ہو گئے۔ مریم ان سے غفا تھی، وہ جانتے
 تھے۔ اسے کچھ دن غفا ہی رہنے دیا جائے تو بہتر
 ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے اس کی بہتری کے لیے ہی
 کر رہے تھے۔ اسے کیا خبر کہ اس کے لیے کیا بہتر
 ہے اور کیا نہیں؟

کچھ دیر بعد شفیق اور سلیم نے اپنی آمد کی اطلاع
 دی۔ وہ راستے کی برف ہٹانے آئے تھے۔ کچھ
 اوزار تھے ان کے پاس۔ وہ اپنے کام میں مگن تھے۔
 ابی جان کو بتا کر وہ ان کے ساتھ باہر نکل گئی۔
 ٹھنڈا بریفلا سو م اسے بے حد پسند تھا۔ برف ہٹاتے
 ہٹاتے وہ لوگ خاصی دور نکل گئے۔ راستہ بہت حد

تک صاف ہو گیا تھا۔

”ناظمہ! کھانا اچھا سا بنانا“ میرے مہمان آرہے ہیں۔“ گھر میں قدم رکھتے ہی ابی جان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور وہ دھک سے رہ گئی اور وہیں ٹھنڈے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ ٹھنڈک اس کے وجود میں سرایت کرتی رہی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا اسے وہیں بیٹھے بیٹھے؟ بھی بڑی تیز آواز میں پچھا تک کھلا اور کوئی بے دھڑک اندر آ گیا۔ مریم نے سراٹھا کر دیکھا، دوسرے لمحے وہ دھک سے رہ گئی آنے والا بھی اسے دیکھ کر چونکا کیونکہ اسے بھی امید نہیں تھی کہ یوں وہ اسے سامنے مل جائے گی۔

”تم..... تم آگئے؟ میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اب..... اب..... وہ دیر سے اپنے نچھوڑو کو سمیٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

آنے والا دیر سے دیر سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دکھ، اذیت اور روحانی تکلیف نے اس کے وجود کا جیسے احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ پٹی اور دوسرے لمحے اندر کی جانب بھاگی۔ آنسوؤں نے راستہ دھندلا دیا تھا۔ باہر شور شرابا تھا، ایک ہنگامہ تھا۔ آج اسے اپنی بے وقتی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ دکھ قیامت کا تھا جس نے رگ جال کو چھید کر رکھ دیا۔

”بی بی! کھانا لگ گیا ہے۔“ ناظمہ نے آ کر اسے اطلاع دی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے کشن منہ سے ہٹائے بغیر کہا۔ ناظمہ چلی گئی۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ اس آواز پر وہ چونکی۔ ٹوبان اس کے کمرے میں موجود تھا۔ بے ساختہ اس نے کشن منہ سے ہٹایا۔ کلمے دروازے کی دونوں چوکتوں پر ہاتھ رکھے ٹوبان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”تمہاری خوشیوں میں شریک ہونے آیا ہوں۔“

”میری خوشی؟“ آنکھیں پھر سے اس کی بھیگنے لگیں۔

”ہاں دادا جان کی پسند تو لا جواب ہے۔“ وہ اندر آ گیا۔

”جیسے تمہارے شوق ہیں، تمہیں باقی خاندان ہی راس آ سکتا ہے۔“ وہ بے انتہا خوش تھا۔ ”خوب پولٹری فارم کھولنا، چوزوں سے انڈے اور انڈوں سے چوزے بنانا۔ فارم ہاؤس بنانا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا اور سنو ڈو چار اسکول بھی بنا ڈالنا۔ بہت پیسہ ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس۔“

اس کی باتیں سن کر اس نے سر جھکا لیا۔ آنسو بھل بھل بننے لگے تھے۔

”میں ابی جان کو لے جانے آیا ہوں۔ یہاں ٹھنڈ بہت ہے، ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے بستر پر بیٹھ چکا تھا۔

”وہ پوچھ رہے ہیں، نکاح سادگی سے ہوگا یا.....“ یہ کہہ کر جیسے ٹوبان نے انتہائی کردی تھی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”نہیں کرنا مجھے کوئی شادی..... میں اپنی زندگی اپنے سہارے گزار سکتی ہوں..... بوجھ نہیں ہوں میں کسی پر..... چاہ کر دوں گی اور ہوٹل میں رہ لوں گی.....“ بازو سے آنکھوں کی دھند صاف کرتے ہوئے وہ بولے گئی۔

ٹوبان ہکا بکا رہ گیا۔ ”ابی جان کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے اتنا سہارا دیا۔ اب میں اس قابل ہو گئی ہوں

کہ اپنا بوجھ خود اٹھا لوں۔“ وہ چیخ چیخ کر روئی اور بستر پر گر گئی۔ ”کوئی کسی کا بوجھ ساری عمر نہیں اٹھا سکتا۔“ وہ ٹڈیال ہو کر گر گئی۔ بھوک، دکھ درد نے اسے خود سے بے خبر کر دیا۔

ٹوبان آگے بڑھا، ابی جان اور ناظمہ اس کی آواز سن کر بھاگے چلے آئے تھے۔ ٹوبان نے اسے سیدھا کیا تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے اس کا وجود بے حد سرد ہو رہا تھا۔

”ابی جان.....!“ وہ خوف سے پلٹا۔ ناظمہ اور ابی جان بھاگے ہوئے آئے تھے۔

”یہ بے ہوش ہے، اسے جوتا سنگھاس جی!“ ناظمہ نے سادگی سے کہا تو ٹوبان جھٹ بولا۔

”پاگل ہو..... میسر یا کا دورہ ہے کیا؟“ اس نے اسے سیدھا کیا۔

ناظمہ نے کبل ڈالا اور پھر ٹوبان اس کی ہتھیلیاں ملنے لگا۔ مریم کا چہرہ بالکل ستا ہوا تھا، تورم آنکھیں، ہیکے ہوئے گال، جیسے کرل صاحب کو کچھ ہونے لگا۔

”کس نے کہا تم مذاق میں اس حد تک جاؤ؟“ کرل صاحب نے غصہ کیا۔

”سوری ابی جان.....! میں نے سوچا کہ.....“ وہ واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔

”بکو مت..... یہاں ڈاکٹر بھی نہیں ملیں گے۔ سارے راستے بند ہیں۔“ کرل صاحب نے ٹھکر سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”مریم.....! مریم.....! یہ تو تم نے بھی آتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔“ وہ نیم جان ہو رہی تھی۔

”آپ ہیں نا ہوم ڈاکٹر۔“ یہ کہہ کر وہ دیر سے سے ہٹا۔

ابی جان نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک بند کی اسے ایک جھٹکا سا لگا، دوسرے ہی لمحے اس کی

آنکھیں کھل گئیں۔

ناظمہ نے منہ پر پانی چھڑکا اور مریم نے عالم بے خبری سے انہیں دیکھا اور سب یاد آنے پر وہ رونے لگی اور اٹھ بیٹھی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“

مریم نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دھند لہرا رہی تھی۔ دونوں دادا پوتا ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر غم سے دیے۔

”بہت برے ہو تم ٹوبان! کیا کہا ہے میری بیٹی سے؟“ کرل صاحب نے ہلکی سی چپت پوتے کو لگائی۔

”کچھ نہیں ابی جان.....! خوشی کی مبارک باد دی تھی، خوشخبری دی کہ میں تمہاری خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے آ گیا ہوں۔ جواب میں یہ.....“ ٹوبان نے ہلکی دانتوں میں دبا کر شرارتی سے لہجے میں کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ ابی جان بھی ہنس رہے تھے۔

”اور کچھ ہونے والے شوہر کے بارے میں.....“ ٹوبان نے قہقہہ لگایا۔

”بکواس بن کر دو.....“ وہ چیخ پڑی۔ ”نہیں کرنا مجھے شادی..... کیا تم نہیں جانتے میرے خیالات؟

کیا اتنی بوجھ ہوں میں کہ کسی بھی لونبھو کے ساتھ چل پڑوں؟“ اس نے دوپٹے سے چہرہ مسلا۔

”لو بھو کہاں صاحب حیثیت صاحب اقدار صاحب خاندان ہیں۔“ ٹوبان نے اپنے کالر جھاڑے۔ ناظمہ نے ہنستے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھے۔

”ٹوبان.....! ٹوبان.....! وہ جنگلی بلی کی طرح کشن لے کر اس پر چھٹی۔“ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے.....

دفع ہو جاؤ..... کوئی نہیں ہے میرا..... کوئی نہیں..... ایک بار پھر سے وہ خود کو کڑکھ کر رو دی۔

کرل اختیار احمد نے ٹوبان کو آنکھوں ہی

ایک طویل زمانے سے اجوائن کو چائے کی پتی کی طرح ابال کر پیٹ کے امراض کے علاج کے لیے اجوائن جراثیم کے نموکوم کرتی ہے۔ نظام ہضم کو بہتر بناتی ہے اور برا نکاش اور نزل زکام کی علامتوں کو گھٹاتی ہے۔ اجوائن کو چل کر کرکٹ جانے اور جھل جانے والی جگہوں پر بھی لگایا جاتا ہے اور اس صورت میں یہ اشنی سپک کا کام دیتی ہے۔ اجوائن عام نزلہ زکام کے لیے بہت زیادہ موثر ہے۔ یہ منفی اثرات جزوی طور پر اجوائن کے تیل میں بھی پائے جاتے ہیں جسے 1900 کے اوائل میں ایک عام اور مقبول جراثیم کش دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اب بھی اس کو کھانسی اور زکام کی متعدد تجارتی دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

”ہیں.....؟“ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔
”ہاں۔“ یہ کہہ کر اس نے برف کا کولہ اس کے منہ پر دے مارا اور اپنا بدلہ لے لیا تھا۔
”ٹوبان کے بچے.....!“ مریم نے برف کا کولہ بنا کر اس پر پھینکا۔

”من کے بچے۔“ وہ زور سے بولا اور مریم بلبش ہو گئی۔ اسی وقت پھاٹک کھلا اور ابی جان کی سنگت میں کچھ لوگ اندر آ گئے۔
دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مریم شرماکر اندر بھاگی اور ہنستے ہوئے ٹوبان ابی جان کی جانب بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ ڈھیروں اطمینان ابی جان کے چہرے پر پھیل گیا۔ یہ ساتیں ان کے لیے ڈھیروں خوشیاں لائی تھیں اور اب زندگی حقیقت میں گنتا رہی تھی۔

ضرورت ہے اور میں..... مریم نے سر گھما کر اس کے صلیج چہرے کو دیکھا۔ کل اور آج میں کتنا فرق تھا! کتنا فریض تھا یہ چہرہ طمانیت تھی اس روپ میں۔
”میں تم لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ میں ماما پاپا کے کسی فیصلے کو قبول نہیں کر سکتا۔ عینی کو بہت سارے لوگ مل جائیں گی مگر مجھے تم نہیں مل سکتیں، تمہیں میں نہیں مل سکتا۔“ ٹوبان جذب دل سے کہہ رہا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح یہ انکشاف سن رہی تھی۔
”نور کی بھی مل ہی جائے گی۔ جب تک میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔ بچوں کو یوشن دوں گا اور اس علاقے کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہم کام کریں گے۔“ ٹوبان کے یہ کہنے پر مریم نے سر جھکا لیا۔ زندگی خود بخود دھربان ہو گئی تھی۔

”دیے تم نے تو اپنے چوزوں، کبوتر، طوطے، بلیوں، خرگوش میں بڑ کر مجھے بھلا دیا تھا۔“ ٹوبان نے پر کشوہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔
”نہیں.....“ بے ساختہ مریم نے سر اٹھایا۔ ”یہ سب تو دھیان بنانے کے بہانے تھے ورنہ.....“ وہ یکدم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”کیا.....!“ وہ برف پر پھسلا۔ ”ذرا پھر سے کہنا۔“ مریم کلکھلا کر ہنس دی اور برف کا کولہ بنا کر اس کے منہ پر دے مارا۔
”ارے..... ارے.....“ وہ بھی ہنس دیا۔ موسم کی خوبصورتی کے ساتھ اس کی دیوانگی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

”اس سے پہلے کہ وقت ہر جانی اور لوگ ظالم سانج بن جائیں، ابی جان شام کو ہمارا نکاح کر رہے ہیں اور اسی مقصد کے لیے وہ ابھی ناظمہ کے ساتھ گئے ہیں، اس کا انتظام کرنے اور وہ نکاح خواں کے ساتھ گواہان کا بھی انتظام کر لیں گے۔“

دی اپنی قسمت پر اپنے صبر پر۔
”یا اللہ.....!“ ٹوبان سر تھام کر کارپٹ پر گر گیا۔ ناظمہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔
”بولو منظور ہے؟“

جواب میں وہ ہنسیکے چہرے سے مسکرا دی۔ قوس و قزح کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر تھے۔
ایک دم سے موسم بدل گیا تھا۔
”آئی ایم سوری ابی جان! میں نے غصے میں نجانے کیا کچھ کہہ دیا؟“ مریم نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

”بچے..... ایہ محبت ہے۔ یہ حق ہوتا ہے۔ اپنا بیت بھرا احساس تھا۔ ویسے ایک گلہ ہے، تم نے اپنے ابی جان کو اتنا برا کیسے سمجھ لیا تھا؟“ کرگل صاحب نے محبت سے پوچھا۔

”نہیں..... ابی جان..... اور اصل وہ..... میں.....“ اس بات پر وہ بوکھلا گئی۔ ٹوبان ہنس رہا تھا۔ مریم نے کشن اسے گھنچ مارا۔ ”کتنا تنگ کیا ہے مجھے.....“
کانچ کی فضا ایک دم سے بارش و بہار ہو گئی تھی۔

☆.....☆
”مگر کیسے ٹوبان؟ تاائی امی اور تایا ابو کیسے مان گئے؟“ کانچ کی میز میوں پر بیٹھے ہوئے مریم نے پوچھا۔
”تم آم کھاؤ، بیڑ کیوں گن رہی ہو؟“ ٹوبان نے محبت سے کہا۔

”اگر بعد میں گتنا پڑ گئے تو؟“ مریم نے فکر سے پوچھا۔
”نہیں اب کبھی نہیں گنتو گی۔“ ٹوبان نے بنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر اتنے دنوں میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ ابی جان کو، اُن کے بڑھاپے کو میری

آنکھوں میں سرزنش کی۔ ٹوبان نے ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ گریہ وزاری کرتی رہی۔
”مریم.....!“ ابی جان نے اسے اٹھایا۔
”کوئی نہیں ہے میرا..... کوئی نہیں.....“ رو رو کر اس کی سیاہ آنکھیں سوچ گئی تھیں چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ٹوبان دور کھڑا بیٹھنے پر ہاتھ باندھ اسے دیکھتا رہا۔
”ہم..... ہم سب تمہارے ہیں مریم.....! تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“ کرگل صاحب نے اسے پیار سے چمکا کر۔
”ہاں، ہم سب دیکھو میں اتنی دور سے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر یہاں اس دامن کوہ میں آ گیا ہوں۔ گھر داماد بننے کے لیے۔“ وہ روئے گئی۔ سوں..... سوں کی وجہ سے اس کی بات ٹھیک سے سن نہیں سکی۔

ٹوبان اس کے قریب آیا۔ ”اے لڑکی.....!“
اس نے اس کا سر اونچا کیا۔ ”کیا کہا ہے میں نے؟ میں نے سب گھر والوں سے بغاوت کر دی ہے۔ میں ابی جان کے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں کوئی گناہ نہیں کر رہا، منالوں گا انہیں۔“ ٹوبان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ سکتے میں رہ گئی۔

”اب بھی یقین نہیں آیا کیا؟“ یہ کہہ کر اس نے اس کے سر پر چٹ لگائی۔ مریم نے بے یقینی سے ابی جان کو دیکھا، انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”ہاں، اے ہم گھر داماد رکھ لیتے ہیں۔“ اندرونی خوشی سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔

”اور..... اور..... وہ.....“ وہ عمر کا خیال آتے ہی ہٹکائی۔

”وہ..... اے کوئی مارو..... وہ بہر دیا اس قابل ہے کہ مریم کی شادی اس سے کی جاسکے؟“ یہ کہہ کر کرگل صاحب نے محبت سے اسے گلے لگایا۔
”ابی..... جان.....!“ وہ ایک بار پھر رو